خاندانِ لوہارو

طاہرہ بانو حجاب

قلعہ لوہارو (فرخ منزل)

نوابزادی طاہرہ بانو حجاب

نوابزادی طاہرہ بانو۔ الحاج نواب سر امیر الدین احمد خان فرخ مرزا اف لوہارو کی صاجزادی ہیں۔ ان کی والدہ کا نام سیدہ جمیلہ بیگم تھا جو خواجہ میر درد دہلوی کی پڑپوتی تھیں طاہرہ بانو ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم دہلی اور ہجرت کے بعد پنجاب سے میٹرک کیا۔ اردو ادب سے دلچسپی کے باعث ادیب عالم اور ادیب فاضل کے امتحان پاس کئے۔ اور جامعہ کراچی سے ایم۔ اے۔ اردو ادب کی ڈگری حاصل کی۔ طاہرہ بانو اپنے ادبی ذوق کی تسکین کیلئے مختلف اخبارات ورسائل میں سماجی اور معاشرتی مسائل پر مضامین لکھتی رہیں۔ حجاب قلمی نام ہے۔ ۱۹۵۳ء میں کراچی میں طاہرہ بانو کی شادی غازی پور (انڈیا) کے زمیندار کنور رشید احمد خان سے ہوئی جو لکھنو (انڈیا) میں ایک بزنس مین اور وسیع جائیداد کے مالک تھے ہجرت کرکے کراچی آگئے تھے۔ ان سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ محمد اکرام رشید، محمد عرفان رشید۔ شادی کے بعد طاہرہ بانو مختلف سماجی کاموں میں حصہ لیتی رہیں زونٹا انٹرنیشنل

خاندانِ لوہارو

مرتبہ

طاہرہ بانو حجاب

فیروز سنز راولپنڈی (پرائیویٹ) لمیٹڈ
15 رحمت سنٹر بلیو ایریا اسلام آباد
111 555 333

نام کتاب : خاندان لوہارو

مرتبہ : طاہرہ بانو حجاب

اشاعت اول : اگست 2002

تعداد : 500

مطبع / پبلشر : فیروز سنز راولپنڈی (پرائیویٹ) لمیٹڈ 15 رحمت سنٹر بلیو ایریا اسلام آباد
UAN 111-555-333

قیمت : -/250 روپے

رابطہ: 35، سٹریٹ 38، F-10/4 اسلام آباد
فون: 63-051-2299062 فیکس: 051-2280070

انتساب

اپنے محترم والد مرحوم

الحاج نواب سرامیرالدین احمد خان

فرخ مرزا فرّخی کے نام

فہرست

بابِ اوّل

باب دوئم

اہل قلم

خاندانِ لوہارو

(ڈیڑھ سو سالہ حکمرانی اور علمی و ادبی خدمات کا تذکرہ)

تعارف

"لوہارو" کی ریاست یوں تو غیر منقسم ہندوستان کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی مگر اس کے حکمرانوں کی علم دوستی وادب شناسی نے اسے ہندوستان کی ایک ممتاز اوراہم ریاست بنادیا تھا۔ یہاں کے حکمراں نہ صرف یہ کہ علم وادب کی سرپرستی کرتے تھے بلکہ خود بھی صاحب قرطاس وقلم تھے، چنانچہ لوہارو کے حکمراں خاندان اوراس سے قرابت اور رشتے داری میں منسلک افراد میں نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ، اسداللہ خاں غالبؔ، نواب زین العابدین خاں عارف، نواب ضیاء الدین خاں نیرؔ ورخشاں، نواب سراج الدین احمد خاں سائل، مرزا ممتاز الدین احمد خاں مائلؔ، نواب مرزا داغ اور ہمارے عہدے کے معروف ومقبول شاعر نواب زادہ جمیل الدین احمد خاں عالیؔ جیسے باکمال شعراء اوراہل فن شامل ہیں۔

طاہرہ بانو حجاب اسی علمی وشاہی خانوادے کی ایک فرد ہیں۔ باذوق ہیں، (حجاب قلمی نام ہے) انہوں نے بجاطور پر سوچا کہ اپنے علمی وادبی گھرانے کے صاحب قلم افراد کا ایک تذکرہ مرتب کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے نوابین لوہارو، نواب زادگان لوہارو اوران سے نسبتی رشتے رکھنے والے ایسے افراد کا ایک مختصر تذکرہ مرتب کردیا ہے جنہوں نے شعروادب کے حوالے سے اپنا کوئی چھوٹا یا بڑا نشان بنالیا ہے۔ یعنی اس میں وہ شعراء بھی شامل ہیں جو اردو شعروادب کی تاریخ کی ناگزیر شخصیات میں سے ہیں اور وہ بھی جو شہرت وناموری کے مقام ارفع تک نہ پہنچ سکنے کے باوصف ادب کی دنیا میں دھندلے یا روشن نقوش قدم ثبت کر گئے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں ریاست لوہارو کا تعارف اور اس کی مختصر تاریخ بھی شامل کردی گئی ہے۔کتاب کی مصنف طاہرہ بانو حجاب چونکہ خود بھی اس خاندان کی ایک اہم فرد ہیں اس لئے انہوں نے شعراء کے حالات میں اپنی خاندانی روایات کو بھی شامل کرلیا ہے۔اس اعتبار سے بہت سی نئی باتیں ان کے حوالے سے معلوم ہوئی ہیں۔

طاہرہ بانو حجاب، معروف معنوں میں نہ محقق ہیں نہ نقاد اور نہ کوئی عالمانہ داعیہ رکھتی ہیں۔انہوں نے یہ تذکرہ محض اپنے ذوق ادبی کی تسکین نیز اپنے خاندان کے ادیبوں اور شاعروں کے حالات محفوظ کرنے کی غرض سے مرتب کیا ہے۔شعراء کے تراجم میں جو اشعار دیے گئے ہیں وہ خاندانی بیاضوں، روایات، حافظے اور کہیں کہیں دوسرے تذکروں سے ماخوذ ہیں۔

حجاب نے سیدھی، صاف اور رواں عبارت میں اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کردیا ہے۔کہیں بھی عبارت آرائی یا غلو سے کام نہیں لیا گیا۔اس لئے یہ تذکرہ روزمرہ کی دہلوی زبان میں ایک ایسا علمی وادبی کام ہے جو آئندہ کے محققین کیلئے بہت کارآمد مواد فراہم کرے گا اور خاندان لوہارو کے مختصر حالات وسوانح اور ان کے علمی کارناموں کی یک جائی سے اس سے رجوع کرنا آسان ہوگا۔

یقین ہے کہ ادبی دنیا میں حجاب کی یہ کاوش مناسب پذیرائی حاصل کرے گی اور نوابین لوہارو کے بارے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا، اس میں گراں قدر اضافہ ثابت ہوگی۔

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

حَامِداً وَمُصَلِّیاً

حرفِ آغاز

"مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں"

تمام حمد وثنا اپنے ربِ کریم کیلئے جس نے مجھے یہ شعور دیا اور مجھ میں یہ خواہش پیدا کی کہ میں اپنی کم مائیگی کے باوجود نہ صرف خود ریاست لوہارو کے بارے میں معلومات حاصل کروں بلکہ اس سے اپنی نئی نسل کو بھی روشناس کراؤں۔ کسی شے کے بارے میں جاننا علم کہلاتا ہے۔ علم آگہی بھی ہے اور قوتِ عمل بھی۔ میرے ادبی ذوق وشوق نے میری ہمت بندھائی۔ اور میں نے اپنی قوتِ عمل کو اپنی جستجو میں ڈھال کر اپنے اسلاف کے بارے میں تحقیق کا کام اور متعلقہ مواد مختلف کتب سے حاصل کر کے جمع کیا ہے کہ پہلے کچھ خاص لوگوں کو اس سے واقفیت تھی۔ مگر ہر نئی نسل کو اپنے اسلاف کے بارے میں جاننے کی خواہش ہوتی ہے تاکہ وہ ورثے کے طور پر اسکو اپنے استعمال میں لائے۔ اب میں یہ علمی خزانہ اپنے خاندان کی نئی نسل کو سونپ رہی ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ یہ کتاب دلچسپی اور خلوص کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ اس سلسلہ میں مجھے اپنے خاندان لوہارو کے آخری نواب امین الدین احمد خان ثانی شہریار مرزا کے چند اشعار بے ساختہ یاد آ گئے۔

یہ مضمون یہ اجداد کی داستاں — برائے عزیزاں ہوئی ہیں بیاں

وہ باتیں جو محبوس سینہ رہیں — عزیزوں سے مخفی خزینہ رہیں

یہی مصلحت اب ہے زیرِ نظر — کہ احوال اسلاف کی ہو خبر

خدا تعالیٰ نے خاندانِ لوہارو کو صاحبِ سیف وقلم بنایا۔ اسلئے ہم اپنے اجداد پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ چونکہ خاندانِ لوہارو ماشاللہ بہت بڑا خاندان ہے اور اس کے اسمائے گرامی کو قلم

کے حصار میں لانا خاصا مشکل کام ہے۔لہٰذا میں نے صرف والیانِ ریاست ہی کا سلسلہ بیان کیا ہے۔جس کی ابتدا ۱۸۰۱ء میں ہوئی اور تقسیم ہند یعنی ۱۹۴۷ء تک جاری رہی۔

مجھے اچھی طرح علم ہے اور آپ سب بھی جانتے ہیں کہ الیکٹرانک کے اس پرآشوب دور میں تاریخ ایک گم گشتہ کہانی بن کر رہ گئی ہے مگر تاریخ خود کو منوالیا کرتی ہے۔اپنی اس کاوش کو اپنی کم فہمی کی بناء پر مکمل تو نہیں کہا جا سکتا۔مگر یہ ہمارے عہد گذشتہ کی یاد دلاتی رہے گی اور ہماری نئی نسل یقیناً اس سے استفادہ کرے گی۔خاندانِ لوہارو کے اہل قلم اور شعراء کے بارے میں جس قدر بھی لکھا جائے کم ہے۔جو کتابیں سامنے آئیں ان میں سے اختصار کے ساتھ لکھ دیا گیا۔مگر یہ احساس اب بھی ہے کہ (ع) کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

طاہرہ بانو حجاب

ریاست لوہارو

ترجمہ۔ از پنجاب گزیٹر جلد نمبر 2 (الف)

ریاست لوہارو ۱۹۰۴ء گزٹ مطبوعہ ۱۹۰۷ء ریاست لوہارو کی قدیم تاریخ کے بارے میں کتابی ذخیرہ کمیاب ہے۔ لوہارو قدیم زمانے میں ریاست جے پور میں شامل تھا۔ لیکن اٹھارویں صدی کے وسط میں بعض جانباز ٹھاکروں نے اس وقت کے رواج کے مطابق جے پور کے تسلط کو تسلیم نہیں کیا اور اپنی آزاد ریاست قائم کی۔

مہاراجہ الور نے مرہٹوں کے خلاف برطانیہ کی حکومت کی وفاداری سے امداد کی۔ اور اس وفاداری کے صلے میں حکومت برطانیہ نے مہاراجہ الور کو لوہارو کا علاقہ سپرد کیا اس کے بعد برطانیہ کی اجازت سے مہاراجہ الور نے ریاست لوہارو نواب احمد بخش خان کو عطا کی کہ انہوں نے مہاراجہ اور حکومت برطانیہ کے مابین وکالت کے فرائض نہایت کامیابی سے انجام دیئے تھے۔ حکومت برطانیہ نے مغل بادشاہ کی سفارش پر نواب احمد بخش کو مرہٹوں سے لڑائی کے بعد بادشاہ کو "آزاد" کرانے کے صلے میں ریاست فیروز پور جھرکہ دے دی۔ (وہ بعد میں بعہد نواب شمس الدین خان ضبط ہوگئی۔ نواب شمس الدین خان کا ذکر آگے آیا ہے)

لوہارو کا رقبہ

ہندوستان کی تاریخ میں صوبہ پنجاب اور پنجاب کی تاریخ میں ریاست لوہارو اور اس کے بانی وحکمران خاندانِ لوہارو کو سماجی ثقافتی اور علمی اعتبار سے اہم مقام حاصل ہے۔ لفظ ''لوہارو'' کے صحیح معنی تو حتمی طور پر نہیں بتائے جاسکتے لیکن روایت سے شہر کا وہ حصہ جہاں لوہار یعنی لوہے کا کام کرنے والے آ کر آباد ہوئے۔ ریاست ستر 70 قصبات پر مشتمل تھی۔ اسکی شمالی سرحد ضلع حصار اور مشرقی ریاست پٹیالہ سے ملتی ہے۔ یہ ریاست پنجاب کے جنوب مشرقی حصے میں واقع ہے۔ اس ریاست کی جغرافیائی حیثیت اس طرح ہے کہ شمال میں ریاست پٹیالہ اور جند۔ جنوب میں شیخاوالی پرگنہ مغربی حدیں جے پور۔ بیکانیر اور بھوانی (تحصیل حصار) ہے ہندوستان میں چھوٹی بڑی چھ سو پانچ 605 ریاستیں تھیں۔ ان میں ایک چھوٹی ریاست لوہارو ہے۔ اس کی حدود میں بچھور نگینہ، سانگرس۔ اور پوناہانہ پرگنے شامل تھے۔ اس ریاست کی بنیاد ۱۸۰۷ء میں پڑی۔ اس کی شمالی سرحد پر بیضوی شکل تیس 30 میل لمبائی اور ساڑھے چھ میل چوڑائی 224 دوسو چوبیس مربع میل پر واقع تھی۔ دیکھنے میں ریاست لوہارو کا منظر ہر طرف یکساں ہے۔ اس خطے میں ہریالی نہیں ہے بلکہ ریت کے ٹیلے ریاست کی شناخت ہیں۔ ریاست کے درمیانی حصے میں کچھ پتھریلی پہاڑیاں ہیں۔ جو اس بات کی علامت ہیں کہ اس علاقے میں نہ تو نالے ہیں نہ دریا۔ ریت کی کثرت کی وجہ سے یہاں معمولی قسم کا چونا پایا جاتا ہے۔ کیکر کے درخت جھنڈ، فرنس۔ کے درخت پائے جاتے ہیں اور بہت پھیلے ہوئے ہیں پیپل، نیم اور شیشم کے درخت بھی وافر ہیں۔ زیادہ تر رقبہ جھاڑیوں پر مشتمل ہے۔ پنجیری اور پھل اس علاقے کے لوگوں کی خاص خوراک ہے۔ ایک خاص پھل جو پیلو کے نام سے مشہور ہے۔ جب کچا ہو تو ٹینٹ اور جب پک جائے تو پنجیری۔ جو مقامی لوگوں کی اہم خوراک ہے۔ خشک سالی کے زمانے میں کیر جس کا کوئی پتا

نہیں ہوتا دو مرتبہ بیر نما پھل دیتا ہے۔ جو کہ غریب آدمی کیلئے قدرت کا تحفہ ہے۔ ایک اور مقامی پیداوار جھاڑ بیری ہے۔ اس کا پھل کھاتے ہیں اور پتے مویشیوں کے چارے کے کام آتے ہیں۔ لکڑی اور کانٹے کھانا پکانے کے ایندھن ہیں۔

حیوانات

مقامی حیوانات میں لگڑ بھگے، بھیڑیئے، لومڑی، خرگوش چکارے قابل ذکر ہیں۔ فاختہ اور کبوتر کے علاوہ کالی مرغابی اور سنہری دونوں قسمیں پائی جاتی ہیں۔ مختلف قسم کے سانپ اور بچھو ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

موسم

گوکہ یہاں کے موسم میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں لیکن گرمیوں میں گرمی کی شدت بہت ہوتی ہے۔ مگر راتیں قدرے بہتر اور ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ ہوا کے جھکڑ کثرت سے آتے ہیں۔ سردیاں بھی شدت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس حد تک کہ درختوں پر اوس جم جاتی ہے۔ لیکن سب سے اچھا موسم ہونے کے علاوہ مٹی کو نکھارنے کیلئے بہترین ہے بارش ناپنے کا آلہ ۱۹۰۴ء میں لوہارو میں نصب کیا گیا۔ اس آلے نے یہ جاننے میں بڑی مدد دی کہ بارش کا اتار چڑھاؤ جون اور ستمبر میں زیادہ ہوتا ہے۔ صاف ہوا اور اچھا پانی لوہارو کو بے مثال صحت بخش جگہ بناتا ہے۔ لوہارو کا صدر مقام لوہارو ہے یہاں قلعہ معلیٰ پختہ بیرونِ قصبہ واقع ہے۔

ایک محل ۱۸۵۳ء میں بعہد نواب امین الدین احمد خان تعمیر ہوا۔ ایوان فرخ مرزا جو معلیٰ القاب فخر والدولہ نواب سر امیر الدین احمد خان بہادر نے ۱۸۸۸ء میں تعمیر کرایا تھا جدید طرز کی عالی شان عمارت ہے۔ مسجد جامع مرزا نذر محمد بیگ ناظمِ لوہارو نے تعمیر کرائی۔ جو کپتان صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ قدیم سکر ہند مندر جس کا سالِ تعمیر معلوم نہ ہو سکا کئی سو برس پہلے کی عمارت ہے۔ بیرون قصبہ جانبِ غرب مولوی عبدالرحمٰن کا مزار ہے جو ایک مشہور بزرگ تھے۔

تاریخی پس منظر

اٹھارویں صدی کے وسط میں بخارا میں ایک رئیس عالی خاندان خواجہ عبدالرحمٰن یسوی اتفاقِ زمانہ سے وطن چھوڑ کر سمرقند سے بلخ آئے اور یہیں قیام کیا۔ عبدالرحمٰن خواجہ احمد یسوی کی اولاد تھے۔ ان کی جائے ولادت ترکستان کے ایک آباد علاقے یس کی ہے۔ بلخ چھوڑ کر یہیں سکونت اختیار کی خواجہ عبدالرحمٰن بلخ میں منتظمِ دیہات اور مہتمم دارلضرب شاہی تھے۔ ان کی شادی خواجہ سفر کی صاحبزادی رابعہ ماہ سے ہوئی۔ خواجہ سفر ملک التجار تھے۔ ان کا شمار سمرقند کے مشاہیر شرفاء میں تھا رابعہ ماہ کے بطن سے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ اور ایک لڑکی عالمہ ماہ۔

رابعہ ماہ

قاسم جان | عارف جان | عالم جان
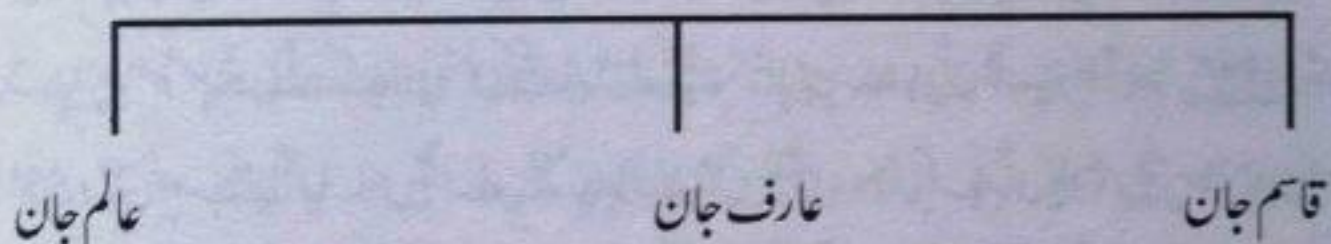
اٹھارویں صدی کے وسط میں یہ تینوں بھائی سمرقند سے پنجاب آئے۔

قاسم جان

قاسم جان کی ولادت ۱۷۲۵ء اور وفات ۱۷۹۷ء میں ہوئی۔ اس زمانے میں نواب معین الملک عرف منوں میاں ناظمِ پنجاب تھے۔ جنہوں نے ان بھائیوں کی بہت قدر ومنزلت کی اس لئے بھی کہ میر منوں کے آباؤاجداد بھی تورانی تھے۔ چنانچہ تینوں بھائی کچھ عرصہ تک ناظمِ پنجاب کے پاس رہے۔ مگر ناظمِ پنجاب کے انتقال کے بعد پنجاب کا کارخانہ درہم برہم ہوتے دیکھ کر قاسم جان اپنے بھائیوں کو لیکر پنجاب سے آگے بڑھے۔ اسی زمانے میں شہزادہ عالی گوہر کو (جو بعد میں شاہ عالم ثانی کے لقب سے بادشاہ بنے) بہار میں تجربہ کار، لائق اور باتدبیر آدمیوں کی ضرورت تھی۔ بہار کی طرف روانہ ہوگئے مگر وہاں پہنچنے سے پہلے میر جعفر ناظمِ بنگال کے بیٹے میر صادق عرف میرن کا ایک قافلہ راستے میں مل گیا۔ جو شہزادہ عالی گوہر کی مخالف فوج کیلئے سامان رسد لے جا رہا تھا۔ قاسم جان نے اس پر حملہ کر کے تمام سامان چھین لیا۔ شہزادے نے اس خدمت پر خوش ہو کر قاسم جان کو ہفت ہزاری منصب کے ساتھ شرف الدولہ سہراب جنگ کا خطاب نوازا۔ اور اپنے رفقاء خاص میں داخل کرلیا۔ قاسم جان کی شادی ایک فوجی سپہ سالار خان ہزارہ کی اکلوتی صاحبزادی عزیز النساء سے ہوئی۔

قاسم جان نے اپنی وفات تک دلی سکونت اختیار کی پرانی دلی میں چاندنی چوک کے ایک محلے میں گلی قاسم جان ان ہی کے نام سے موسوم ہے۔ اسی محلے میں قاسم جان نے ایک حویلی اور ایک مسجد تعمیر کی۔ قاسم جان کے دو بیٹے شرف الدولہ فیض اللہ بیگ اور قدرت اللہ بیگ تھے۔ فیض اللہ بیگ کے بیٹے غلام حسین مسرور تھے جو مرزا غالبؔ کے ہم زلف زین العابدین عارف کے والد تھے۔

قدرت اللہ بیگ کی بیٹی نواب ضیاء الدین نیر رخشاں کی بیگم تھیں۔ نواب قاسم جان دہلی میں سکونت اختیار کرنے کے بعد معاملات سلطنت میں دخیل رہے۔ دلّی میں وفات کے بعد حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے سماع خانے کے صحن میں مدفون ہیں۔

عارف جان

نواب عارف جان اپنے بڑے بھائی قاسم جان کے ہمراہ دلّی آئے۔اور یہیں سکونت اختیار کی۔عارف جان کی شادی مرزا قلیچ بیگ کی بیٹی سے ہوئی۔ مرزا محمد قلیچ بیگ گورنر اٹک تھے۔عارف جان کا جو شجرہ حکومت پنجاب کے پاس ہے اسے نواب ضیاء الدین احمد خان نے مرتب کر کے دیا تھا۔اسمیں بھی عارف جان کو خواجہ احمد یسیوی کی اولاد ظاہر کیا ہے۔

نواب عارف جان نے اپنی ذاتی قابلیت سے فیروز پور جھرکہ جو کہ گوڑگانوہ کی ریاست کہلاتی تھی۔اور لوہارو کی جاگیر حاصل کی۔نواب عارف دیہاتوں اور جاگیر وغیرہ کے منتظم تھے اپنی ہمت اور شجاعت کے ساتھ نواب نجف خان ذوالفقار الدولہ سپہ سالار کے قوت بازو بنے رہے۔

نواب عارف جان کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی جن کے نام۔

بیٹے۔ احمد بخش خان۔ الٰہی بخش خان معروف۔ نبی بخش خان۔ محمد علی۔
نواب عارف جان کی بیٹی مرزا غالبؔ کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ سے منسوب تھیں۔

نواب عارف نے اپنی زندگی نہایت عیش و آرام میں گزاری اور دِلّی میں وفات پائی۔

عالم جان

نواب عالم جان کے حالات اور اولاد وازواج کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔اغلب ہے کہ لاولد ہے اور چھوٹے بھائی ہونے کے سبب بڑے بھائیوں کی زیر کفالت اور نگرانی میں رہے۔کسی کتاب میں ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

نواب احمد بخش خان

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب آب حیات میں تحریر کیا ہے کہ نوجوان احمد بخش خان نے اپنی سپاہیانہ زندگی کا آغاز مرہٹہ فوج سے کیا۔ اور کچھ عرصہ بعد وہ مہاراجہ الور کے پاس چلے گئے۔ مہاراجہ الور نے احمد بخش خان کو لارڈ لیک کا ایجنٹ بنوادیا۔ لارڈ لیک اس وقت کمانڈر انچیف کے عہدے پر فائز تھے۔ چنانچہ احمد بخش خان ان کے ساتھ نہایت بہادری اور سیاسی سوجھ بوجھ کے ساتھ رہے۔ اور قدم قدم پر اپنی بہادری اور جرأت کا ثبوت دیا۔ ایک مرتبہ مہاراجہ الور اور لارڈ لیک کے درمیان معاہدے کی گفتگو ہوئی تو احمد بخش خان نے خاصہ اہم رول ادا کیا۔ چنانچہ اس معاہدے کی خوشی میں مہاراجہ الور نے ضلع گوڑگاؤں میں پوناہانہ، فیروز پور جھرکہ، بنہانا، سنکارا، بچھور اور لوہارو کے دیہات بطور جاگیران کو بخش دیئے۔ اور حکومت ہند نے اس کی تصدیق کی ان دیہاتوں سے تین لاکھ سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ اسی کے ساتھ حکومت ہند سے فخر الدولہ دلاور الملک رستم جنگ کے خطابات سے بھی نوازا گیا۔ اس وقت مرہٹے مغل سلطنت کے ''اتحادی'' نگران اور عملاً دہلی وآگرہ پر بادشاہ کی مرضی سے قابض تھے۔ کچھ عرصے بعد برطانوی اور الوری فوجوں نے آگرہ کی جنگ میں مرہٹوں کو شکست دے کر بادشاہ کو ان سے آزاد کرایا اور اس کے ''ماتحت اتحادی'' ہو گئے۔

نواب احمد بخش خان نے فیروز پور جھرکہ میں جو مسجد بنوائی وہ اب بھی موجود ہے۔ موضع بھیڑہ میں ایک کچا قلعہ تھا۔ جسمیں یہ مسجد تعمیر کرائی گئی۔

فخر الدولہ رستم جنگ نواب احمد بخش خان
والئی بانی ریاست لوہارو فیروز پور جھرکہ

قطعہ جامع مسجد لوہارو

لطفِ رب المشرقین ومغربین
گشت چوں نظر محمد را نصیب
ساخت مسجد بہرِ تسبیح وصلواۃ
چاہ کابش ہست شہد زینت
وقف کردہ دہ دکان از بہرِ حق
نیز یک مہماں سرائے دلفریب
چوں عزیز از غیب سالش ساختہ
گفت مسجد ہست بنیادِ غریب ۱۲۷۹ھ

اردو ترجمہ

رب المشرقین ومغربین (یعنی اللہ تبارک تعالیٰ) کی مہربانی سے حضرت محمد ﷺ کی نظر نصیب ہوئی۔ اور تسبیح وصلوٰۃ (یعنی عبادات) کے لئے مسجد تعمیر کرائی اور اسکی زینت کیلئے ایک کنواں بنوایا۔ اللہ تعالیٰ کے نام پر دس دکانیں وقف کیں اور ایک دلفریب (یعنی خوبصورت) مہمان سرائے بھی بنوائی (اور) جب عزیز نے اس کا سال (یعنی تاریخ) وضع کی تو جواب آیا۔ مسجد ہست بنیادِ غریب یعنی مسجد کی بنیاد غریب نے رکھی ۱۲۷۹ھ

۱۸۰۳ء نواب احمد بخش خان والئی لوہارو کی سربراہی میں لارڈ لیک کا جلوس فتح آگرہ

نواب شمس الدین احمد خان

نواب احمد بخش خان نے ۱۸۲۲ء میں اپنے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خان کو ریاست الور اور برطانوی حکومت ہند کی منظوری سے اپنا وارث بنانے کا اعلان کیا۔ شمس الدین احمد خان کے علاوہ نواب احمد بخش خان کے دو بیٹے اور بھی تھے۔ جو شمس الدین سے چھوٹے تھے جیسے جیسے احمد بخش خان کی عمر بڑھتی جارہی تھی۔ انہوں نے اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں کو کچھ نہ کچھ دینے کی کوشش کی اور اسی چیز نے مستقبل میں مصائب اور مسائل پیدا کئے۔

مصنف جناب عبداللہ ملک صاحب اپنی کتاب ''محمود علی قصوری'' میں خاندانِ لوہارو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مغل تاریخ کے مشہور مصنف PERCIVAL SPEAR۔ جو کیمرج میں تاریخ کے استاد تھے۔ اپنی مشہور کتاب "TWILIGHT OF MOGHALS" میں نواب شمس الدین احمد خان کے بارے میں ولیم فریزر کے قتل کے عنوان سے ایک الگ باب باندھا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں کہ ۱۸۲۵ء میں شمس الدین احمد خان نے اپنے والد کے کہنے پر لوہارو کی آمدنی اپنے دو چھوٹے بھائیوں کیلئے وقف کر دی اور پھر پوری ریاست کا انتظام بھی ان کے حوالے کر دیا۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نواب احمد بخش خان انتقال کر گئے اور اپنے پیر و مرشد مولانا فخر الدین اورنگ آبادی کے مزار کے پاس جو دور آخر کے جلیل القدر اولیاء میں تھے دفن ہوئے۔ نواب احمد بخش خان کی آنکھ بند ہوتے ہی تینوں بھائیوں میں چپقلش شروع ہوئی اور پھر یہ معاملہ بڑھا تو رزیڈنٹ دہلی کے یہاں پیش کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سپریم گورنمنٹ نے ۱۸۲۸ء میں لوہارو کا تمام تر انتظام اور قبضہ دونوں بھائیوں کے حوالے کر دیا۔ اور دونوں کو اس بات کا پابند کر دیا کہ بڑے بھائی امین الدین احمد خان دہلی کے خزانے میں سالانہ

پانچ ہزار دو سو دس 5210 روپے اس وقت تک جمع کراتے رہیں جب تک ان کا چھوٹا بھائی خود مختار نہیں ہو جاتا۔ اور خود مختار ہونے کے بعد ریاست دونوں بھائیوں میں برابر تقسیم کر دی جائے گی۔ اس فیصلے سے دونوں بھائیوں اور نواب شمس الدین احمد خان میں رنجش اور بڑھ گئی۔ شمس الدین احمد خان نے لوہارو کے زمینداروں کو اس بات پر اکسایا کہ وہ دونوں بھائیوں کو ریاستی ٹیکس اور ادائیگیاں نہ دیں۔ کولبروک کے جانشین مارٹین نے تجویز کیا کہ ''لوہارو'' کو دوبارہ شمس الدین احمد خان کے حوالے کر دیا جائے۔ اور بدلے میں دونوں بھائیوں کو مقررہ رقم ادا کی جائے۔ مارٹن کی اس تجویز پر دونوں بھائیوں نے اعتراض کیا۔ چنانچہ جنگ و جدل کی یہ کیفیت برسوں تک چلتی رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سپریم گورنمنٹ نے ۱۸۳۲ء میں ایک بار پھر ''لوہارو'' کو اس شرط پر شمس الدین احمد خان کے حوالے کیا کہ وہ بدلے میں بھائیوں کو نقد رقم ادا کیا کریں گے۔ اور حکومت کے بقایا جات بھی شمس الدین احمد خان ادا کریں گے۔ ان دنوں ولیم فریزر گورنر جنرل کا ایجنٹ تھا۔ اس نے اپنی اشتعال انگیز طبعیت سے کام لیتے ہوئے دونوں بھائیوں کے معاملے کو اٹھایا۔ اسی مناقشت کو بڑھانے کیلئے فریزر کا دوست کول بروک کا ٹریویلین موجود تھا۔ جو کلکتہ میں حکومت کے سکریٹری کے طور پر کام کر رہا تھا۔ ہمیں بنیٹی نوک کے نام میٹکاف کے ایک خط میں قانونی معاملوں میں اس کی ہمدردی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس موقع پر فریزر کا خط ملاحظہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ اس نے اس معاملے میں کتنی گرم جوشی دکھائی۔ اور اتنی ہی گرم جوشی ٹریولین دکھا رہا تھا۔ لیکن اسے درست طریقہ نہ آتا تھا۔ ایک فریق حکومت کے ہوتے ہوئے ولیم فریزر کی یک طرفہ حمایت کا مخالف تھا۔ فریزر شمس الدین احمد خان کے والد کے وارث کے معاملے میں امین الدین کی سرپرستی کر رہا تھا۔ ولیم فریزر نے امین الدین کو اپنا کیس مضبوط کرنے کیلئے کلکتہ جانے کے لئے اکسایا شمس الدین احمد خان ولیم فریزر کو اپنی مکمل کامیابی کی راہ میں رکاوٹ تصور کر رہا تھا۔ اور یہ رکاوٹ قتل کیے بنا دور نہ ہوتی تھی۔ ولیم فریزر شمس الدین احمد خان کے باپ کا دوست تھا اور اس سے بالکل بیٹوں کی طرح سلوک کرتا تھا۔ اور اپنا زیادہ وقت بھی اس کے ساتھ
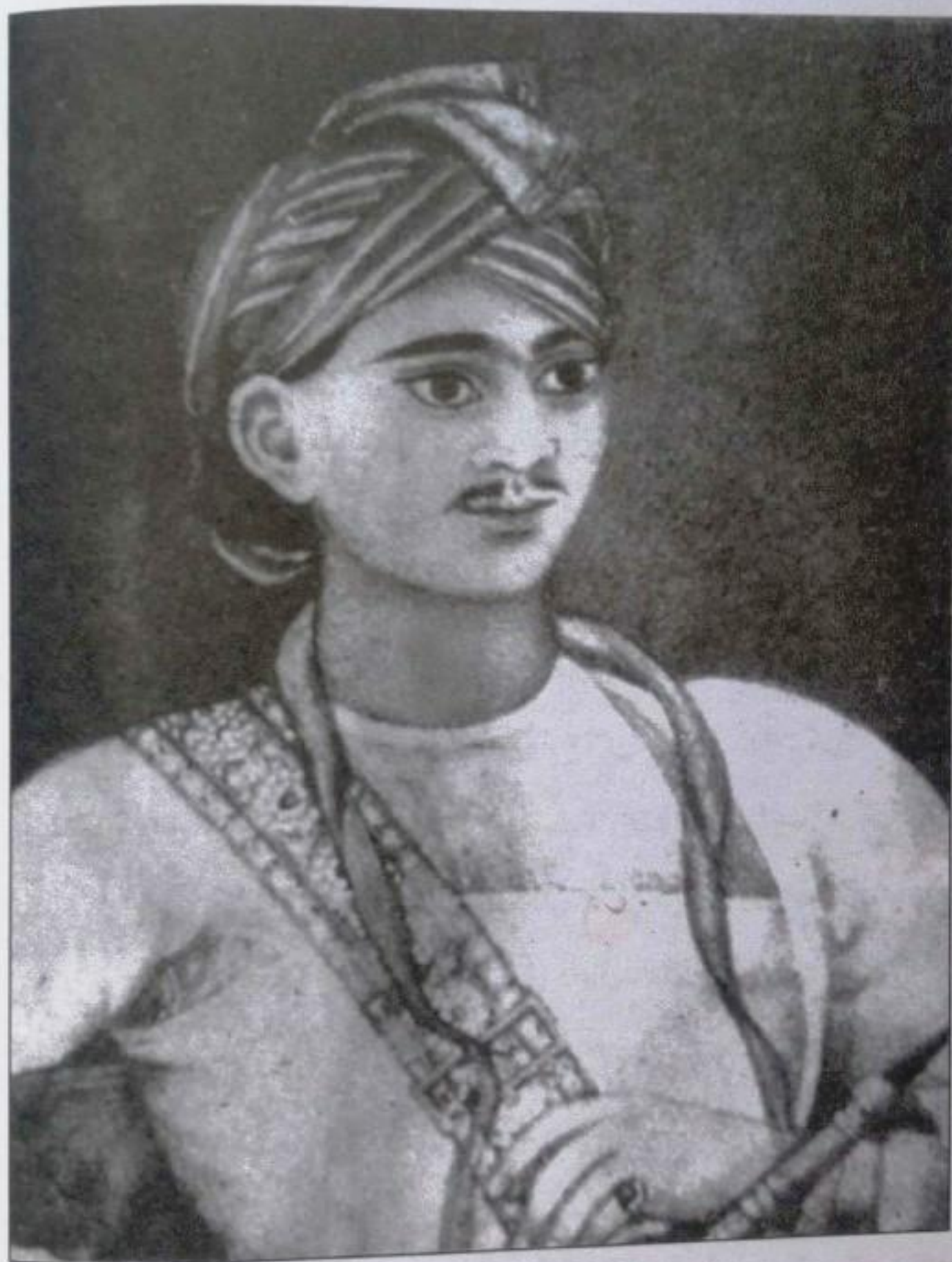
فخر الدولہ دوئم نواب شمس الدین احمد خان صاحب
والی ریاست فیروز پور جھرکہ ولوہارو

گذارتا تھا۔ لیکن اب اسے یہ سوچ کر ولیم فریزر سے نفرت ہونے لگی تھی۔ کہ وہ اس کے بھائیوں کے معاملے میں اس سے بے انصافی کر رہا ہے۔ شمس الدین احمد خان نے ولیم فریزر کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ دہلی کے محل میں نواب شمسالدین کا ایک دوست ''مغل بیگ'' تھا۔ جو نواب شمس الدین کو ولیم فریزر کے معمولات سے آگاہ کر سکتا تھا۔ اس دوست کا گھر دریا گنج دہلی میں تھا۔ جہاں شمس الدین کے ایجنٹ بغیر کسی شک وشعبہ کے پناہ لے سکتے تھے۔ فیروز پور میوات کی سرحد کے قریب ہے۔ جو صدیوں سے ضرب المثل کے طور پر سرکش علاقہ تھا۔ وہاں نواب شمس الدین کو اس کام کیلئے کسی جدوجہد کی ضرورت نہ تھی۔ نواب شمس الدین نے ''کریم'' نامی ایک شخص کو اس کام کیلئے چنا۔ یہ شخص ''بھرمارو'' یعنی تیز تیز بندوق چلانے والوں کے طور پر مشہور تھا۔ بظاہر اس کو دہلی بھیجا گیا۔ جہاں اس نے شہر کے ایک یورپی تاجر مسٹر ایم فرسن M. PHERSON کی ایجنسی کو ایک چھکڑا فروخت کرنا تھا۔ لیکن اس کے ذمہ اصل کام کچی دھات سے تانبے کی نقل کرنے کا فن سیکھنا اور کتے فروخت کرنا تھا۔ یہ آخری کام نواب شمس الدین اور اس کے ایجنٹ کے درمیان خفیہ اشارے کا کام دینا تھا۔ کریم خان ستمبر ۱۸۳۴ء کو دہلی آیا۔ اور دریا گنج میں قیام کیا۔ یہاں وہ ولیم فریزر کی عادات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ فیصلہ کیا گیا کہ قتل رات کے وقت ہونا چاہئے۔ اسطرح قتل کے الزام سے بچنے کیلئے اچھا موقع ملتا تھا۔ ولیم فریزر کا محل پہاڑی کی ڈھلوان پر تھا۔ جو بعد میں ''ہندوراؤ ہاؤس'' کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ یہاں سے روزانہ لکھنو کا سل میں اپنے دفتر جایا کرتا تھا اور اکثر شہر یا اس کے نواح میں شہر کے اشرافیہ یا راجاؤں سے ملنے چلا جاتا۔ ایسے شخص کو جو فریزر کی طرح ہندوستانیوں کے ساتھ بلا تکلف گھل مل جاتا ہو۔ قتل کرنے کے بہت زیادہ مواقع تھے۔ لیکن ولیم فریزر کے ساتھ ہمیشہ گھڑ سوار ہوتے تھے۔

کریم خان میوات کے ایک میو خدمت گار ''آنیا'' کے ساتھ فریزر کی نگرانی کرتا اور اس کا انتظار کرتا تھا۔ لیکن فریزر کو اکیلا نہ پاتا۔ یہاں تک کہ وہ رات کو بھی اکیلا نہ ہوتا تھا۔ تین مہینوں کی جدوجہد کے بعد وہ فیروز پور ناکام لوٹا۔ نواب اب سنگدل ہو گیا تھا۔ کریم خان نے

نواب شمس الدین کے اس حکم کی روشنی میں کہ صرف ایک رات میں گولی ماردی جائے۔فریزر کی نگرانی جاری رکھی۔اس باروہ کشمیری گیٹ میں کرنل اسکنرز کے نزدیک ٹھہرا۔یہاں وہ اپنے شکار کے زیادہ قریب تھا۔کئی ہفتے اور گزر گئے۔اس تمام عرصے میں نواب کا چھوٹا بھائی امین الدین احمد خان ولیم فریزر کی معاونت سے کلکتہ میں اپنے مقدمے کی پیروی کرتا رہا تھا۔قتل کی پیش رفت کے بارے میں پوچھنے پر کریم نے نواب شمس الدین کو بتایا کہ ''کتے'' بہت زیادہ حفاظت میں تھے۔اس کا جواب نواب نے اپنے ہاتھ سے لکھا۔

''تم نے لکھا ہے کہ کتوں کے ساتھ اردلی ہوتا ہے۔یہ اشخاص جو کتوں کے ہمراہ ہوتے ہیں ان کے سرپرست ہوتے ہیں یا محض ساتھ دینے کیلئے کتوں کے ہمراہ جاتے ہیں۔تمہیں کتوں کا پیچھا کرنا چاہئے۔لیکن اسطرح کہ کسی پر ظاہر نہ ہو۔''

کریم خان نے مذید دو خط اور لکھے۔کریم خان نے نگرانی کے کام کو اور بڑھایا۔آخر کار اسے معلوم ہوا کہ ولیم فریزر شہر کے نواح میں ہندراؤ کے گھر ۱۳ مارچ کو ایک تقریب میں شرکت کرے گا۔کریم خان معمول کے مطابق ولیم فریزر کے انتظار میں سڑک پر بیٹھ گیا۔لیکن اس رات فریزر دوسرے راستے سے گھر لوٹا اور یوں کریم خان ایک بار پھر ناکام ہوا۔۲۲ مارچ کو کیشن گڑھ کے راجہ نے اپنے نواحی مکان میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔کریم دوبارہ انتظار کرنے لگا۔مگر اس بار وہ ناکام نہیں ہوا۔گیارہ بجے رات گولی چلی اور اس کے ساتھ ہی دہلی کا متلون مزاج شخص ولیم فریزر مر چکا تھا۔مس میٹکاف کو اس کے مینشن میں جگایا گیا تھا۔مٹیکاف کی بیٹی نے اس قتل کو اسطرح بیان کیا۔

''میں اور جارج ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ہمارے ساتھ ہماری ماں بھی تھیں مجھے وہ شام یاد ہے جب وہ درمیان میں بیٹھے ہوئے تھے۔جب میرے والد نپولین گیلری میں تھے۔پورا گھر ایک ہندوستانی گھر کی طرح خاموش اور ساکت تھا۔اچانک نوکروں میں ایک ہل چل سی

بچ گئی۔ میرے والد تیزی سے کمرے میں آئے اور بتایا کہ فریزر مر گئے ہیں۔ اور وہ فوراً ہی قتل کی معلومات کیلئے باہر چلے گئے۔ مجھے اسوقت اپنی ماں کی کپکپاہٹ اور اپنے باپ کی حفاظت کے خیال سے بچگانہ خوف بھی یاد ہے کہ فریزر قتل ہوئے ہیں شاید میرے والد بھی ہوں''

قتل کے بعد کریم خان نے کھروں کے نشانات چھپانے کیلئے گھوڑے کے پاؤں کے سموں میں جوتے پہنا دیئے۔ شام کے وقت وہ شہر میں داخل ہوا۔ اور وسائل خان کے گھر میں چھپ گیا۔ اس نے اپنی بندوق ایک کنوئیں میں پھینک دی۔ اسے اس وقت وہاں محفوظ ہونے کا یقین تھا۔ جب تک پہلی آندھی ٹل نہیں گئی۔ محل کے مغل بیگ نے اسے یقین دلایا کہ اس بات کا کسی کو پتہ نہیں کہ مرنے والے کا مخالف کون تھا۔؟ کریم خان کا شریک جرم واپس فیروز پور بھاگ گیا۔ کیونکہ وہ ان ہی دیہات کا رہنے والا تھا۔ لیکن کریم کو اس وقت کے ضلع کے غیر معروف افسر جون لارنس کا علم نہ تھا۔ جوان دنوں پانی پت میں تھا۔ اس نے یہ خبر ۲۳ مارچ کو صبح اس وقت سنی۔ جب وہ گھنٹوں کام کے بعد نہا رہا تھا۔ وہ فوری طور پر مٹیکاف کی مدد کیلئے چالیس میل دور دہلی چلا گیا۔ مٹیکاف کو فتح خان نامی ایک شخص نے پہلے ہی اس قتل کے بارے میں بتا دیا تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس کے بارے میں امکان تھا کہ نواب شمس الدین اسے پھنسائے گا۔ یہ بات لوگوں میں عام تھی کہ نواب شمس الدین اس قتل کے محرکات جانتا ہے لیکن یہاں John کا ''مقامی علم'' کام آیا۔ وہ جانتا تھا کہ وسائل خان نواب کا تعلقدار تھا۔ چنانچہ اس نے فوری طور پر اس کا گھر تلاش کیا۔ اس کے گھر میں ایک گھوڑا کھڑا تھا جس کے کھر صاف ستھرے تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کھروں کو ڈھانپنے کی چیز ابھی اتاری ہے۔ لارنس نے گھوڑے کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ صحن میں ٹہلنے والے شخص نے کہا کہ گھوڑے کو اسکی اپنی خوراک نہیں دی گئی ہے۔ اسے غلّہ دیا گیا ہے جو اس نے بڑے شوق سے کھایا ہے۔ لارنس نے صحن میں ٹہلنے والے شخص کو فوری طور پر گرفتار کر لیا۔ یہ ٹہلنے والا شخص کریم خان تھا۔ اُس کے کوارٹر کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے خطوط بر آمد ہوئے۔ جس سے اس کی اور نواب شمس الدین خط و کتابت طشت از بام ہوئی۔ سر دست کریم خان

کے خلاف قرائن کے کی گواہی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے اپنی گنہگاری پر احتجاج کیا اور کہا کہ وہ دہلی میں اپنے مالک کیلئے محض کتے حاصل کر رہا تھا۔ وہاں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے نواب کا قتل سے کوئی تعلق بنتا ہو۔ چنانچہ اس قتل کی گم شدہ کڑی کریم خان کے میواتی شریکِ جرم ''آنیا'' کی صورت میں ملی۔ اگر نواب دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے ''آنیا'' کو تحفظ دیتا تو تمام صورت حال اس کے حق میں جاتی۔ لیکن کریم خان کی گرفتاری نے اسے پریشانی اور تذبذب کے الیے سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ''آنیا'' پر اعتبار کیا جا سکتا ہے کہ وہ خاموش رہے؟ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ اسے قتل کرا دیا جائے تا کہ امکانی شہادت ہی ختم ہو جائے۔ لیکن اگر ایسا ہو تو کون اس کام کو رازداری سے انجام دے سکتا تھا۔ اور اگر ایسا ممکن ہو جائے گا تو اس کی ملازمت سے غیر حاضری کا علم تو ضرور حکومت کو ہو جائے گا اور اسطرح معاملہ اور بگڑ جائے گا۔ ''آنیا'' کو پتہ چلا کہ اس کے قتل کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ تو وہ اپنے گاؤں بھاگ گیا۔ وہ کچھ دن پہاڑیوں میں چھپا رہا۔ لیکن آخر کار فیروز پور میں اپنی زندگی سے مایوس ہونے کے بعد اس نے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنے فیصلہ کیا۔ اور یوں اس قتل کی بڑی گواہی میسر آ گئی ''آنیا'' کے اعتراف نے گواہی کی اس قانونی زنجیر کی تمام کڑیوں کو اکٹھا کر دیا۔ اور نواب شمس الدین کو گرفتار کر لیا گیا آخر میں بندوق اتفاقی طور پر کابل گیٹ کے قریب کنوئیں سے اس وقت برآمد ہوئی جب ایک قیمتی برتن کو کنوئیں سے نکالنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چنانچہ اس ڈول کے ساتھ بندوق بھی برآمد ہوئی۔ دوسری طرف ''آنیا'' کی گواہی نواب کی قسمت کا لکھا بن گئی۔

نواب شمس الدین کے مقدمے کا جج رسٗل کولِون جو بعد میں شمالی جنوبی صوبہ جات کا گورنر جنرل بنا۔ اور جنگ آزادی کے دوران آگرہ میں اس کی موت واقع ہوئی۔

چنانچہ ۱۳ اکتوبر ۱۸۳۵ء میں کشمیری گیٹ کے باہر نو سو فوجیوں کے پہرے میں نواب شمس الدین اور کریم خان کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا PERCIVAL SPEAR کا کہنا ہے کہ دہلی میں جہاں شمس الدین کو پھانسی دی گئی۔ لوگوں میں خاصی ہل چل محسوس کی گئی۔ اور پھانسی کا

نظارہ کرنے کیلئے ایک ہجوم کشمیری گیٹ کے باہر جمع ہوگیا۔اور سرکاری ڈھنڈورچی لوگوں کو آگاہ کرتے رہے کہ وہ پولیس کے سپاہیوں کو عبور کرنے کی کوشش نہ کریں۔

کہتے ہیں کہ نواب شمس الدین نے بڑی مردانگی سے جان دی۔نواب ضمیر مرزا کی زبانی معلوم ہوا کہ جب وہ پھانسی کیلئے جا رہے تھے تو راستے میں ایک دکان پر کسیرو دیکھے (پھل کا نام)اور جو افسران کی پالکی کے ساتھ تھا۔اس سے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں کسیرو کھاؤں۔اس نے پالکی رکوائی اور کسیرو خریدے۔جب پالکی چلی تو نواب کسیرو کھاتے جا رہے تھے۔اس واقعہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی موت کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور قطعی پریشان نہ ہوئے۔پھانسی کے بعد ان کی لاش قبلہ رخ ہوگئی۔عام لوگوں نے اسے نواب کی بے گناہی کا ثبوت قرار دیا۔اور لوگوں میں مشہور ہوگیا کہ نواب کی روح مکہ مدینہ پرواز کرگئی۔

نواب شمس الدین کی میت ان کے خسر مغل بیگ کے قدم شریف میں دفن کی۔اور ایک مدت تک ان کی قبر زیارت گاہ عوام رہی۔نواب شمس الدین احمد خان پھانسی پا گئے تو فیروز پور جھرکہ کی جاگیر ضبط ہوگئی یوں ”لوہارو“ کی جاگیر کو سیاسی طور پر زبردست اہمیت ملی۔اور یہ خاندان لوگوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف مزاحمت کا نشان بن گیا۔
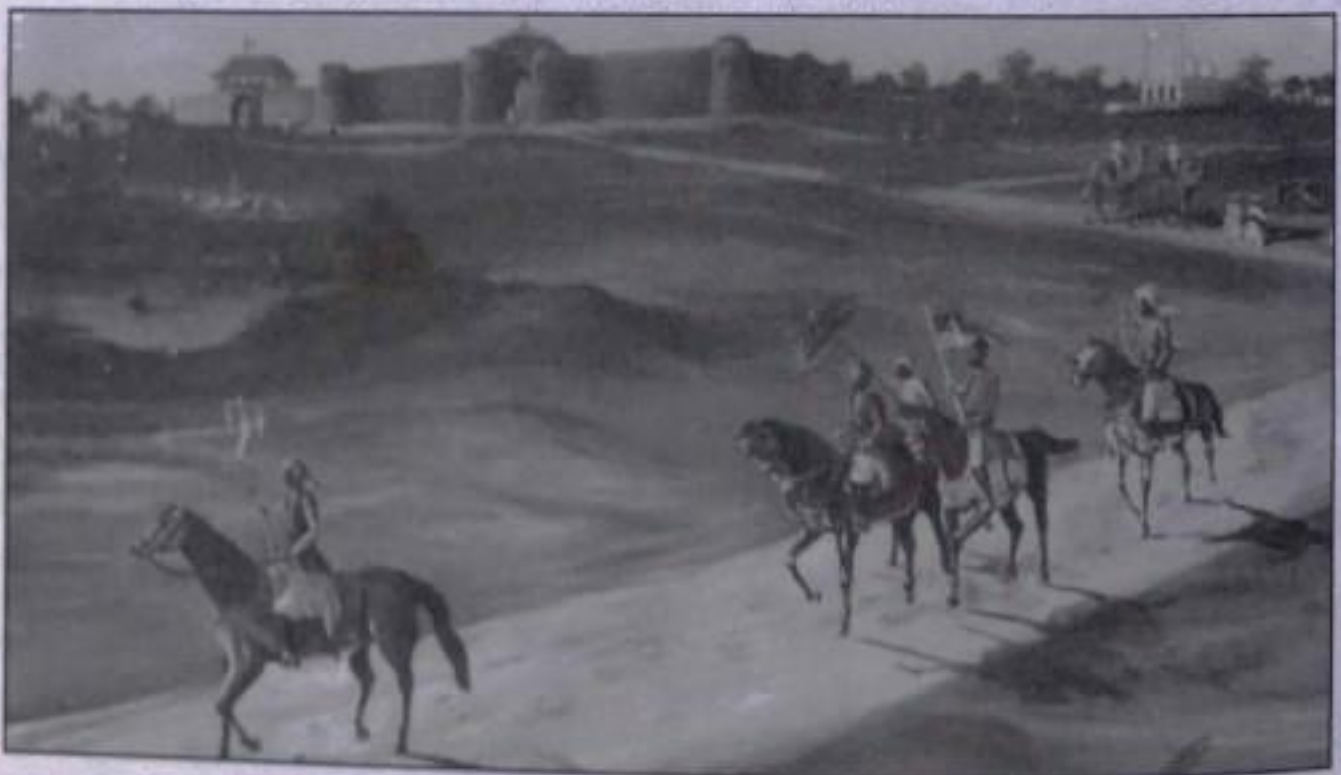
انیسوی صدی میں قلعہ لوہارو کا ایک بیرونی منظر پہلی فصیل

نواب امین الدین احمد خان اوّل

نواب امین الدین احمد خان ۔نواب شمس الدین احمد خان کے بھائی تھے۔ چونکہ نواب شمس الدین احمد خان کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی صرف بیٹیاں تھیں اسلئے امین احمد خان ریاست کے وارث بنے۔نواب امین الدین احمد ۱۸۱۴ء میں فیروز پور جھرکہ میں پیدا ہوئے۔نہایت خوش وضع اور وجیہ نوجوان تھے۔ان کی شادی نواب غضنفر الدولہ محمد وزیر بیگ عرف منیڈھو خان رسالدار سلطنت اودھ کی صاجبزادی ولی انساء بیگم سے ہوئی۔جن کے بطن سے نواب علاؤ الدین احمد خان پیدا ہوئے۔

نواب امین الدین احمد خان شجاعت میں مشہور اور ارادوں میں مضبوط نوجوان تھے۔پچیس سواروں کا دستہ نواب امین بہادر کا ذاتی محافظ تھا۔ایک سو دس سپاہیوں کی ذاتی فوج تھی۔جس کی تربیت کی طرف نواب امین الدین نے خاص توجہ دی۔غدر یعنی جنگِ آزادی کے بعد نواب امین الدین احمد خان کو دربار میرٹھ۔دربار انبالہ اور دربار لاہور میں ویسرائے ہند نے شریک ہونے کی دعوت دی۔ویسرائے ہند کے دربار اوّل میں نواب امین الدین کا استقبال بحیثیت خود مختار رئیس کے کیا گیا۔۱۸۶۲ء میں لارڈ کیننگ نے نواب امین الدین احمد کو سند تہنیت مرحمت کی۔جس میں اس امر کی توثیق کی گئی کہ رئیس لوہارو ان کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ حکومت کرینگے نواب امین الدین کے عہد حکومت میں رعایا نے بغاوت کی کوشش کی مگر نواب اپنی حکمت عملی سے ان کی سرکشی پر غالب آئے۔اور امن بحال کرنے میں کامیاب ہوئے۔نواب امین الدین احمد خان نے وصولیابی مالگذاری میں ترمیم کی۔بٹائی کا پرانا طریقہ منسوخ کیا اور نقد تشخیص کا نظام نافذ کیا۔جس سے رعایا کو فائدہ ہوا۔ریاست لوہارو میں برطانوی ڈاک خانہ ان

کے عہد حکومت میں قائم ہوا۔ایک وسیع بازار بھی قائم ہوا۔نواب امین الدین کا زیادہ وقت علمی سرگرمیوں میں گزرا پھر صحت خراب رہنے لگی۔ابھی ان کی عمر ستاون سال کی تھی کہ بروز جمعہ ۳۱ دسمبر ۱۸۶۹ء میں انتقال کر گئے۔اور وہ دہلی میں قطب صاحب کے نزدیک اپنے والد کی قبر کے پاس مدفون ہیں۔

نواب امین الدین احمد خان اوّل

نواب علاء الدین احمد خان علائی

نواب امین الدین احمد خان اوّل کی وفات کے بعد نواب علاء الدین احمد خان اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ نواب علاء الدین احمد خان ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۸۷۰ء میں ان کو مسند نشین کیا گیا۔ اس وقت ریاست لوہارو انبالہ کی کمشنری کے تحت تھی۔ مسند نشینی کی تقریب میں بہت سے یورپی اور ہندوستانی مہمانوں کی شرکت ہوئی۔ نواب علاء الدین کی شادی نجیب آباد کے نواب جلال الدین احمد خان نبیرہ نواب نجیب الدولہ کی صاحبزادی شمس انساء سے نجیب آباد میں ہوئی۔

نواب علاء الدین احمد خان نے رعایا کے انصاف کیلئے عدالتیں قائم کیں۔ جے پور کی ٹکسال ختم کی گئی اور انگریزی سکہ اور اوزان قائم کئے گئے۔ ریاست جے پور، بیکانیر، جیند اور پٹیالہ کے ساتھ مجرموں اور ملزموں کے تبادلہ کی غرض سے معاہدات کئے گئے۔ تمام راہ گزار اور راستے چوروں اور ڈاکوؤں سے محفوظ کئے گئے۔ بوجہ قحط ۱۸۷۷ء میں ریاست کو ایک بحران کا سامنا تھا مگر یہ انتشار بغیر کسی جانی و مالی نقصان کے ختم ہوا۔

لارڈ نارتھ بروک نے جو اس وقت گورنر جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۸۷۴ء میں نواب علاء الدین احمد خان کو فخر الدولہ کا خطاب عطا کیا اور ۱۸۷۷ء میں نواب نے دہلی میں شاہی مجلس میں شرکت کی۔

نواب علاء الدین احمد خان ریاستی امراء۔ نوابین مہاراجگان اور خود برطانوی افسر شاہی میں خاصے مقبول تھے۔ چنانچہ پنجاب کے گورنر لارڈ ایچی سن نے جنہوں نے عالمی شہرت
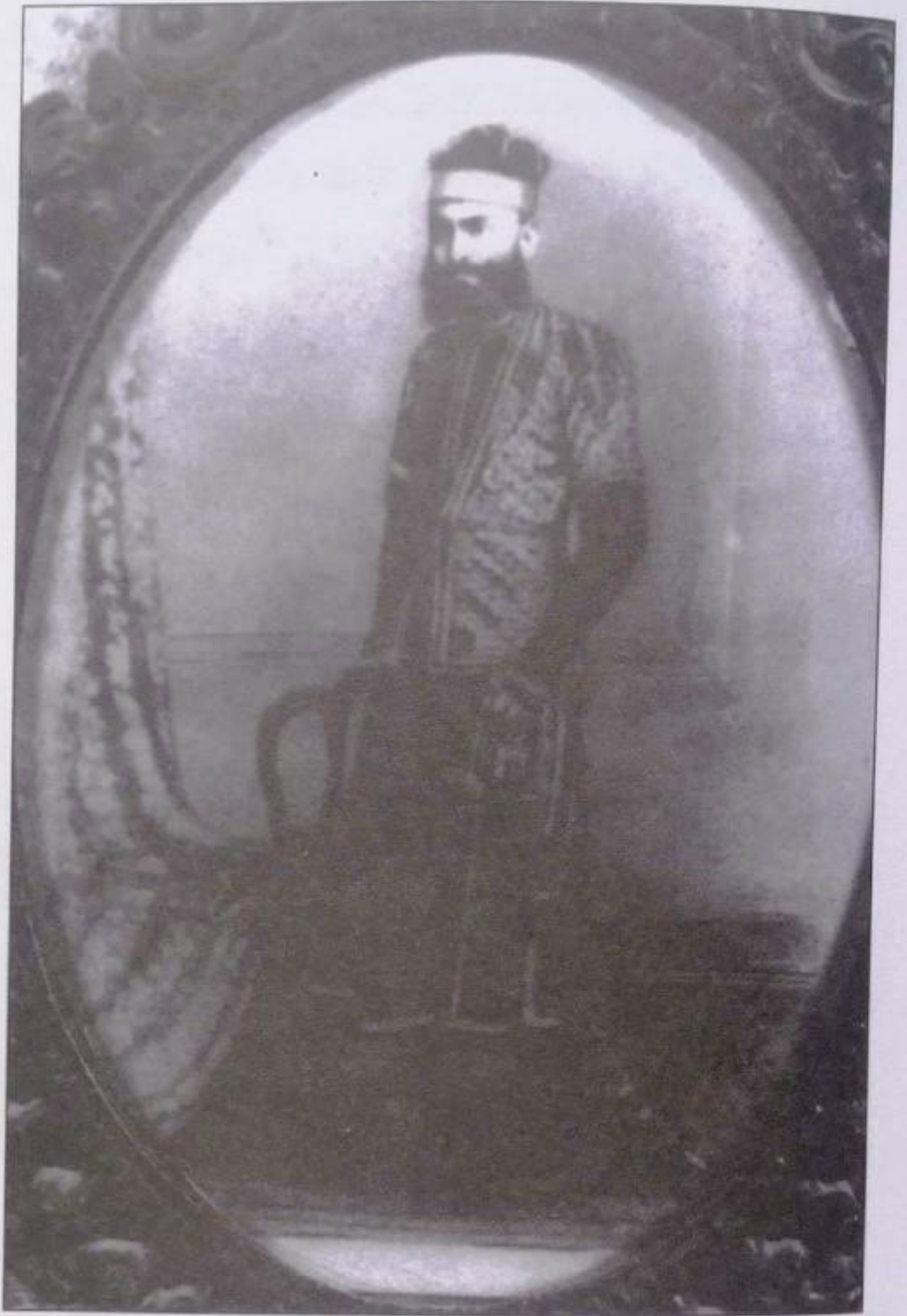
نواب علاء الدین احمد خان علائی والیٔ لوہارو

مرزا غالبؔ کے شاگرد اور خلیفہ

کی درس گاہ۔ ایچی سن کالج کی بنیاد رکھی۔ نواب علاء لادین کے متعلق لکھا تھا کہ نواب علاء الدین احمد خان ایک علم دوست اور عالم شخص ہے نواب علاء الدین علوم مشرق کے ساتھ انگریزی میں بھی مہارت کامل رکھتے تھے۔ علائی تخلص کرتے تھے۔ نواب علاء الدین کا زیادہ وقت علمی وادبی مشاغل میں گزرتا تھا۔ خود بہت اچھے شاعر تھے۔ مرزا اسد اللہ غالب کے محبوب شاگرد تھے۔ اسی لئے غالب نے ان کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔

نواب علاء الدین احمد خان مستقل لوہارو میں رہتے تھے۔ اور اپنی اولاد کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے تھے۔ انگریز مصنف SCAVEN BLUNT ۔نے اپنی کتاب ''دو عہد زرین'' میں نواب علاء الدین احمد کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ دراصل یہ ایک ذاتی روزنامچہ ہے۔'' لکھتے ہیں کہ ۲۲ فروری ۱۸۸۴ء کو میں دہلی پہنچا اور سب سے پہلے دہلی کے روٴساء مین نواب علاء الدین احمد خان والی لوہارو اور ان کے فرزندِ اکبر امیر الدین فرخ مرزا سے ملاقات ہوئی۔ نواب علاء الدین نے ایک ہوٹل میں ہمارے لئے کمرے مخصوص کرار کھے تھے۔ وہ ہمیں وہیں لے گئے۔ وہاں ان سے خوب اور طویل تبادلہ خیالات ہوا۔ نواب علاء الدین احمد انگریزی خوب بولتے ہیں۔ انہوں نے حالات مصر میں بھی دلچسپی کا اظہار کیا۔ (برنٹ پہلے مصر میں تھے) شام کو میں نواب علاء الدین کے دولت کدہ پر تعظیماً گیا۔ نواب نے مجھے بتایا کہ وہ ایک نجیب الطرفین ترک نزاد ہیں۔ تین پشت گزری کہ خاندان سمرقند سے ہندوستان آیا۔ شادیاں صرف ترک نسل خاندان میں ہوئیں۔ نواب علاء الدین کا خیال تھا کہ ان کے عم زاد بھائی نواب شمس الدین احمد خان کو جو پھانسی دی گئی ہے۔ وہ انصاف کے تقاضوں کے برعکس تھی۔ نواب علاء الدین احمد کا خیال ہے کہ پہلے تو ولیم فریزر نے نواب شمس الدین سے رشوت لی اور ان کو لوہارو کا نواب بھی بنوایا۔ مگر املاک چونکہ بہت وسیع ہوگئی تھیں اور انگریز چاہتے تھے کہ فیروز پور جھرکہ ضبط کیا جائے۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے بہانہ تلاش کیا۔

بلنٹ کا کہنا ہے کہ نواب علاء الدین احمد نے ان کو آگاہ کیا کہ سقوط دہلی کے وقت ۲۲ ہزار لوگ ہلاک ہوئے یا ان کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ اور گولی ماردی گئی، توپوں سے اڑایا گیا۔ تمام شہر خالی ہو چکا تھا نواحی علاقوں کی بستیاں اور آبادیاں مسمار ہو گی تھیں۔ نواب علاء الدین احمد خان ایک عمیق نظر رکھتے تھے۔ انگریزی جانتے تھے اور بحیثیت اک فارسی اور عربی عالم کی ان کی شہرت بہت تھی۔

نواب علاء الدین احمد خان نے مرزا غالبؔ کی نگرانی میں تعلیم پائی۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ مرزا غالبؔ نے ان کو سند دی اور اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کیا۔ اس زمانے کے مطابق ان کا فارسی کلام زیادہ ہے۔

۱۸۸۱ء میں نواب علاء الدین علائی (وسط) میں اپنے صاحبزادوں کے ساتھ بائیں طرف بیٹھے ہوئے مرزا امیر الدین فرخ مرزا

کھڑے۔ مرزا ضمیر الدین۔ مرزا نصیر لدین۔ مرزا بشیر الدین۔ مرزا عزیز الدین۔ دوسرے عزیز

(بشکریہ نوابزادہ محبوب علی خان اف مالیر کوٹلہ)

نواب علاء الدین احمد خان نے ایک شاندار زندگی گذارنے کے بعد عنان حکومت اپنے فرزندِ اکبر امیر الدین احمد خان کو سونپ دی۔

نواب علاء الدین کی ایک ہی بیوی تھیں۔ شمس انساء یہ نجیب الدولہ کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے بطن سے پانچ فرزند پیدا ہوئے اور پانچ صاحبزادیاں۔

فرزند۔

مرزا امیر الدین احمد خان۔ مرزا اعزیز الدین احمد خان۔ مرزا بشیر الدین احمد خان۔ مرزا نصیر الدین احمد خان۔ مرزا ضمیر الدین احمد خان

صاحبزادیاں۔

رضیہ بانو بیگم۔ زبیدہ بانو بیگم۔ صفیہ بانو بیگم۔ صالحہ بانو بیگم۔ سلمیٰ بانو بیگم

نواب علاء الدین احمد خان کے سب فرزند صاحب اولاد تھے سوائے ضمیر مرزا کے ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ یہ سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔

نواب علاء الدین کو علمی مشاغل سے شغف تھا۔ انہوں نے لوہارو میں "فخر المطابع" کے نام سے ایک چھاپے خانہ بھی قائم کیا۔ جہاں سے علمی وادبی کتابوں کی طباعت ہوتی تھی۔ ایک اخبار بھی امیر الاخبار کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ شطرنج کے عمدہ کھلاڑی تھے۔ ایک شطرنج سوسائٹی قائم کی گئی انگریز ممبروں کے ذریعے اس دلچسپ کھیل کی روداد اور نقشے یورپ بھیجے جاتے تھے۔ کھیل کی روداد اکمل الاخبار دہلی میں چھپا کرتی تھی۔

نواب علاء الدین احمد نے ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں وفات پائی اور قطب صاحب میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔

ہز ہائی نس نواب سر امیر الدین خان فرخ مرزا فرّخی

نواب سر امیر الدین احمد خان فرخ مرزا فرخی نواب علاء الدین احمد خان علائی کے فرزند تھے۔ اپنے والد بزرگوار کی طویل بیماری کے سبب۔ انتقال سے دو برس قبل ہی ریاست لوہارو کا انتظام ان کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

نواب امیر الدین احمد ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔ چودہ برس کی عمر سے ہی امور ریاست میں دلچسپی لیتے تھے اور اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان کی نگرانی میں لوہارو میں تالاب اور کنوئیں بنوائے گئے۔ باغات تیار کیے گئے کہ ریگستان میں سبزہ نظر آئے۔ انواع واقسام کے پودے لگائے گئے۔ جو خوب پروان چڑھے۔ پانی کی دستیابی کا خاص انتظام کیا گیا۔ دہلی کے کمشنر جیمز میکناب نے امیر الدین خان کو مسند نشین کیا اس رسم میں ہندوستان اور پنجاب کے رؤساء وامراء شریک ہوئے۔ نواب امیر الدین احمد خان کو ۱۸۹۳ء میں C.I.E کا خطاب عطا ہوا۔ اور اسی سال ریاست مالیر کوٹلہ کا انتظام بھی ان کے سپرد کیا گیا۔ نواب امیر الدین احمد خان ۱۸۸۵ء میں امپیریل لیجلیٹو کونسل کے رکن ہوئے اور ۱۸۸۹ء میں پنجاب کونسل کے، بعد میں ان کو C.S.I.E کا خطاب سر کے خطاب کے ساتھ عطا کیا گیا۔ اور نو 9 توپوں کی سلامی غالباً لوہارو کے ہم مرتبہ تو کجا اس سے کہیں بڑی ریاستوں کے والیان کو بھی یہ خطابات نہیں ملا کرتے تھے۔ نہ ملے۔ مثلاً دوجانہ، پٹودی جو ہم عصر اور کسی قدر چھوٹی ہونے کے باوجود دلّی سے متصل کہلائے جانے کی وجہ سے ہم درجہ کہی جاسکتی تھیں۔ اسی طرح پنجاب اور باقی ہندوستان کی بے شمار ریاستیں تھیں جن کے والیان کو نہ سر کا خطاب ملا نہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل (بہ سراہی ویسرائے ہند) کی رکنیت۔ انگریز حکومت نے نواب سر امیر الدین کو 100 سو بندوقیں جدید طرز کی عطا کیں کہ ریاست کی سپاہ کو وقت

کے تقاضوں کے مطابق باقاعدہ مسلح رکھا جائے۔ نواب سرامیر الدین احمد ایک بہت بار سوخ۔ منصف مزاج اور خدا ترس رئیس تھے۔ انگریز حکمران طبقہ اور رؤساء ان کے مشوروں سے مستفید ہوتے تھے۔ نواب امیر الدین احمد خان لوہارو کے عوام کی خدمت کا خاص خیال رکھتے تھے۔

۱۹۰۳ء میں لارڈ کرزن نے دربار کیا تو نواب سرامیر الدین نے اسمیں شرکت کی۔ بعد ازاں ۱۹۱۱ء میں دربار شہنشاہ جارج پنجم میں بھی شرکت کی۔

مصنف عبداللہ ملک ایڈووکیٹ اپنی کتاب ''محمود علی قصوری'' میں لکھتے ہیں جب نواب امیر الدین کو ریاست کی باگ ڈور تھمادی گئی تو نواب کی عمر بیس پچیس سال ہوگی۔ یہ نوجوان ہفت زبان تھا۔ فارسی، عربی، اردو اور انگریزی میں بلا کی روانی تھی۔ اور خطابت میں بھی ایک مقام حاصل تھا۔ یہ اس وقت کے نامور نوجوان مہاراجہ بھوپندر سنگھ آف پٹیالہ کے ہم عصر تھے۔ نواب امیر الدین کو امپیریل لیجسلیٹو کونسل کا ایڈیشنل رکن نامزد کیا گیا۔ اور ساتھ ہی ان کو سر کا خطاب بھی دیا گیا۔ اس سے دو سال پہلے جب ریاست مالیر کوٹلہ کے نواب وفات پا گئے تو نواب سرامیر الدین کو مالیر کوٹلہ کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا۔ چنانچہ نواب امیر الدین نے کمال ذہانت کے ساتھ مالیر کوٹلہ کے انتظامات کو درست کیا۔ اور ان کی آمدن میں اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کی فوج کو جدید ترین خطوط پر منظم کیا۔ اس کے محکمہ مال کو از سر نو درست کیا۔ ۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۲ء تک اور تقریباً نو سال تک ایڈمنسٹریٹر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۰۲ء میں انہوں نے مالیر کوٹلہ کا چارج ولی عہد صاحبزادہ احمد علی خان کے سپرد کیا۔ لیکن اس کے بعد بھی دو تین سال تک مالیر کوٹلہ کی مشیری کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ نواب امیر الدین کی ذہانت اور تربیت کے بارے میں لاتعداد قصے مشہور ہیں۔ مثلاً جب سر جان لارنس پنجاب کے گورنر بن کر لاہور میں آئے اور انہوں نے لاہور میں اپنا دربار منعقد کیا تو اسمیں نواب امیر الدین نے بھی جن کی عمر اس وقت تقریباً سات یا آٹھ سال ہوگی شرکت کی۔ چنانچہ سر جان لارنس اپنی یادداشتوں میں اس دربار کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس دربار میں تمام عمر کے لوگ دیکھنے میں آئے۔ جہاں سفید ریش بزرگ تھے۔ وہاں سات آٹھ سالہ

ہز ہائی نس نواب سر امیر الدین احمد خان فرخ مرزا فرخؔ والئی لوہارو

نواب لوہارو بھی تھے۔ جنھوں نے اپنے فرائض نہایت مشاق اور تربیت یافتہ شہزادے کے طور پر نبھائے۔ ان کے چہرے ہی سے مردانگی پھوٹ رہی تھی۔

نواب سر امیر الدین نے اس کے بعد دوسرا دربار جس کو انہوں نے نہ صرف دیکھا بلکہ اس میں شرکت کی۔ وہ ملکہ وکٹوریہ کا امپیریل دربار تھا جو ۱۸۷۷ء میں دہلی میں منعقد ہوا۔ اس وقت نواب امیر الدین کی عمر صرف سترہ 17 سال تھی۔ اس کے بعد انہوں نے تین درباروں میں شرکت کی جو ۱۹۰۳ء ۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۱ء میں منعقد ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم میں نواب سر امیر الدین نے اپنی خدمات حکومت برطانیہ کو پیش کیں۔ ان کو حکومت برطانیہ نے بغداد میں اپنا سیاسی سفیر مقرر کیا۔ ان کا عہدہ تھا۔

His Britanic Majestys Political envoy BASRA under the British resident of BAGDAD عراق جب ترکوں کے ماتحت تھا۔ تو اس کو تین ولایتوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ان میں ایک ولایت یا صوبہ بصرہ بھی تھا۔ انگریز حکومت کے نزدیک بصرہ کی بے حد اہمیت تھی۔ یہ شط العرب کے دہانے پر واقع تھا۔ جو ان کی "اینگلو پرشین کمپنی" کے لئے بہت اہم تھا۔ تیل کی کمپنی اس کے قریب واقع تھی۔

بہرحال جنگ کے بعد جب ترکوں کو شکست ہوئی اور ترکوں کی حکومت کے حصے بخرے کئے جانے لگے۔ اور عرب علاقوں کو تقسیم کیا جانے لگا اور عراق کیلئے الگ بادشاہت کا منصوبہ تیار ہوا۔ تو اس بادشاہت کیلئے نواب امیر الدین کا نام بھی برطانوی حلقوں میں کافی دنوں زیر غور رہا۔ چنانچہ اس تجویز کا ذکر اس زمانے میں ایک طرف ہندوستان کے اخبارات میں بھی چل نکلا۔ اور خواجہ حسن نظامی نے بھی اس طرف توجہ دلائی۔ اب اس امر کی تصدیق نواب امیر الدین کے ایک نواسے جنرل شیر علی نے اپنی تازہ کتاب The Elite Minority Princess of India میں بھی اس امر کی تصدیق کی ہے۔

ABOVE Leading princes in the 1920s: from left to right, the rulers of Kalsia, Loharu Mandi, Nawanagar, Jammu and Kashmir, Kapurthala, Alwar, Patiala, Bikaner, Bhar and Palanpur. A photograph taken at the Silver Jubilee of Maharaja Jagatjit Singh of Kapurthala. (Popperfoto)
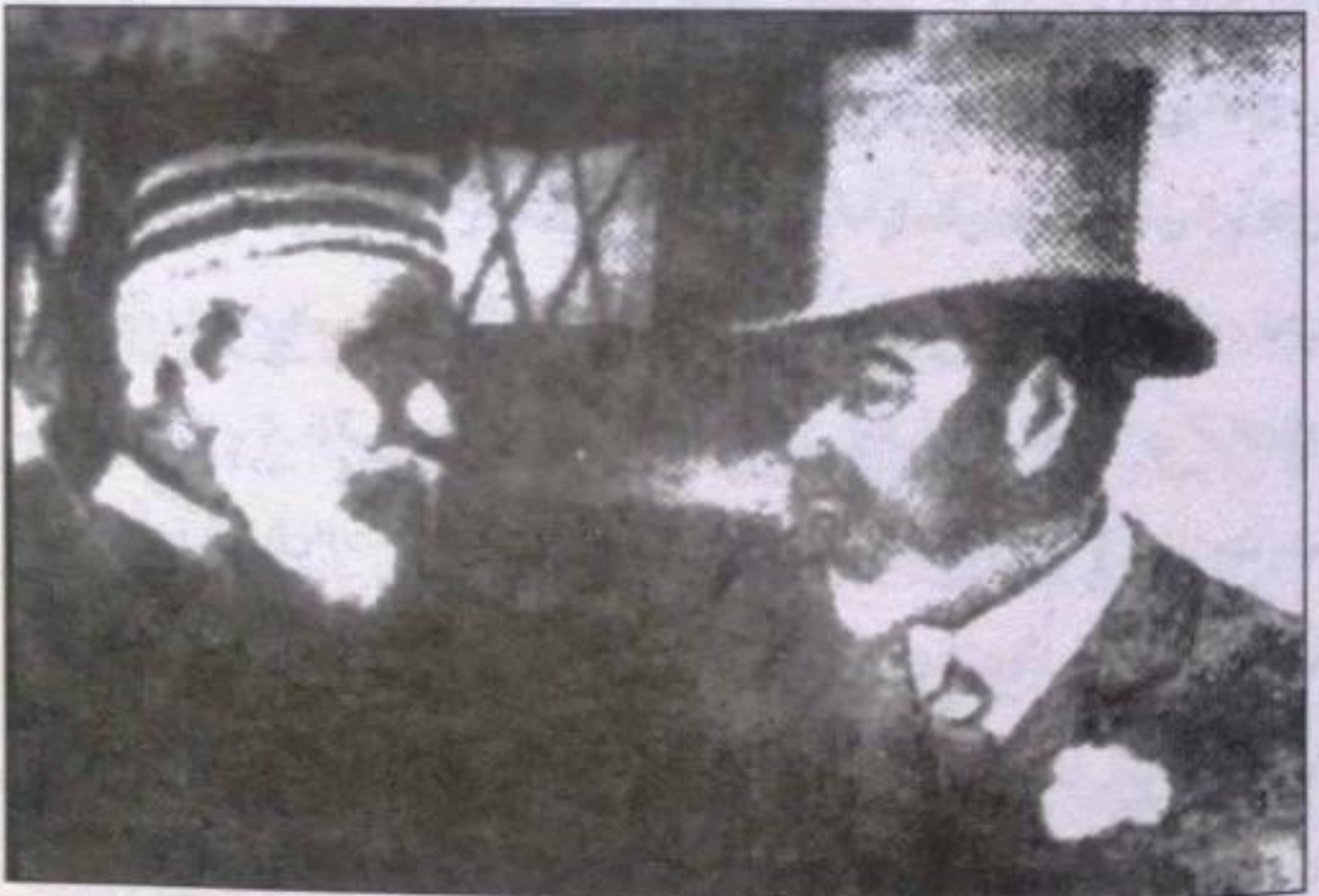
شاہی مقام نشست ایسکٹ ۔ ASCOT برطانیہ کا مشہور ریس کورس ۱۹۲۵ء شہنشاہ جارج پنجم
کے ساتھ نواب سر امیر الدین احمد خان فرخی

ویسے پہلے جنگِ عظیم کے سلسلے میں جب نواب امیر الدین کو ہندوستان سے باہر جانا پڑا تو انہوں نے ایک طرح اپنے آپ کو ریاستی امور سے علیحدہ کر لیا اور اس کا انتظام اپنے بڑے بیٹے کے سپرد کر دیا۔ ویسے بھی لوگ اس مختصر سی ریاست کے انتظام و انصرام کو انکی قابلیت کیلئے بہت ہی محدود سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ پہلے دن سے ہی مسلمانوں کی اس دور کی سیاست میں پیش پیش رہے۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء میں دہلی میں جو انڈین محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سولہواں اجلاس ہوا۔ اس کے وہ صدر مجلس استقبالیہ تھے۔ اور کانفرنس کے صدر آغا خان تھے۔ مسلم لیگ کے قیام میں بھی وہ پیش پیش رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہندوستان کی ریاستوں کے سربراہوں کو ان کی مشکلات میں اپنے مشوروں سے نوازتے رہے۔ بلکہ جب ان راجاؤں اور نوابوں کی گدیوں کے جھگڑے ہوتے تو یہ کسی نہ کسی فریق کی حمایت میں حکومتِ ہند اور حکومتِ برطانیہ سے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ۱۹۲۵ء میں ریاست بھوپال کی حکمران خاتون کا حکومت ہند سے اور ان کے بعد ان کے جانشین کے قبضے پر اختلاف ہو گیا۔ وہ اپنے چھوٹے بیٹے حمید اللہ کو اپنے بعد جانشین بنانا چاہتی تھیں۔ لیکن حکومت ان کے بڑے بھائی کو گدی کا حقدار سمجھتی تھی۔ چنانچہ گورنر جنرل نے والی بھوپال کی خواہش کو ٹھکرا دیا اس پر والی بھوپال نے انگلستان جانے کا فیصلہ کیا تو دوسرے بھائیوں نے نواب امیر الدین کو اپنا وکیل بنا کر انگلستان بھیجا۔ اس موقع پر گو نواب امیر الدین کو کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ لیکن روایت یہ ہے کہ ان کی شہنشاہ برطانیہ سے اس موقع پر جو ملاقات ہوئی۔ وہ خاصی دلچسپ تھی۔ کیونکہ نواب امیر الدین کثیر الاولاد تھے۔ ان کی کئی لڑکیاں اور لڑکے تھے۔ ان کی بیٹیوں کی شادیاں بہت ہی با اثر والیان ریاست سے ہوئی تھیں۔ چنانچہ ان کی ایک بیٹی مہربانو بیگم نواب سر قطب الدین خان والئی ممدوٹ سے بیاہی گئیں۔ دوسری بیٹی فخر بانو بیگم نواب محمد ابراہیم خان اف مانگرول سے بیاہی گئیں۔ تیسری بیٹی بلقیس بانو بیگم نواب سر احمد نواز خان اف ڈیرہ اسماعیل خان اور چوتھی بیٹی نواب ابراہیم علی خان اف پٹودی سے بیاہی گئیں چنانچہ شہنشاہ جارج پنجم نے نواب امیر الدین سے مذاقاً کہا۔

"If you carry on your daughters Marriages that way, I fear to lose my INDIAN EMPIRE to you" نواب سرامیر الدین نے بادشاہ کے ساتھ دعوت پر DERBY گھوڑوں کی ریس دیکھی۔ اس موقع پر ایک چھوٹی سی ہندوستانی ریاست کے والی کیلئے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ نواب صاحب کی شخصیت اور اسکی خبر لندن کے اخبارات میں چھپی۔

نواب امیر الدین سیاسی مشن پر جب بصرہ بھیجے گئے۔ تو یہ جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا عزیز الدین کو ریاست لوہارو کا ناظم مقرر کیا۔ جنہوں نے نواب امیر الدین کی غیر موجودگی میں ریاست کا نظام بطریق احسن چلایا۔ نواب امیر الدین اور ان کے بھائی عزیز الدین میں بہت محبت و شفقت تھی۔ دونوں میں بڑا تعاون تھا۔ جس کی وجہ سے ریاست میں نظم وضبط اور بالا دستی قانون کی حالت بہت اچھی تھی۔ قحط آنے کی وجہ سے ریاست کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے زمانے میں ڈاکوؤں کا خوف اور لوٹ مار ہوا کرتی تھی۔ مگر نواب امیر الدین اور مرزا عزیز الدین کے زمانے میں ریاست کا امن درہم برہم کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔ ریاست لوہارو میں ڈاکوؤں کا وجود تو درکنار۔ علاقہ غیر کا کوئی ڈاکو بھی لوہارو کے راستے سے گزرنے کی ہمت نہ کرتا۔ کیونکہ ایسے عناصر کیلئے عبرتناک سزائیں تجویز کی گئی تھیں۔

نواب سرامیر الدین ایک خاص مغل انداز کی زندگی بسر کرتے تھے۔ نہایت اعلیٰ وارفع لباس زیب تن کرتے اور مغل بادشاہوں کی طرح نفیس غذائیں استعمال کرتے۔ اگرچہ لوہارو میں ذرائع آمد و رفت بہت سست رفتار تھے۔ پھر بھی صبح کا ناشتہ تازہ پھلوں سے کیا جاتا جو بذریعہ ڈاک روزانہ متصل تحصیل انگیزی بھوانی سے منگوائے جاتے اور اونٹ کے ذریعے باقاعدگی سے مہیا ہوتے۔ نواب سرامیر الدین نے پانچ شادیاں کیں۔ (بیک وقت دو صرف آخری دور میں رہیں) ان کی پہلی شادی مرزا شہاب الدین احمد کی دختر اختری بیگم سے ہوئی۔ جن کے بطن سے ان کے چار فرزند اور چار صاحبزادیاں ہوئیں۔

فرزند۔

معزالدین اکبر مرزا (جواں مرگ)۔، اعزالدین اعظم مرزا (ولی عہد)۔ اعزازالدین شاہرخ مرزا۔ اعتزازالدین ہمایوں مرزا۔

صاحبزادیاں۔

فخر بانو بیگم۔ شہر بانو بیگم۔ بلقیس بانو بیگم۔ مہر بانو بیگم۔

پہلی بیگم کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی۔ان کا لقب سرکار محل تھا۔وہ لاولد رہیں۔ان کے انتقال کے بعد تیسری شادی کی۔ان سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ مرزا افضل الدین مگر نواب سر امیر الدین کی ان سے ذہنی وابستگی نہ ہوسکی۔اور ان کو طلاق ہوگئی۔ کچھ عرصہ بعد نواب صاحب نے چوتھی شادی اپنے رشتہ داروں میں سیّدہ جمیلہ بیگم سے کی۔سیّدہ جمیلہ بیگم بنت سید خواجہ ناصر وحید نبیرہ خواجہ میر درد مرحوم (دہلوی) تھیں خواجہ ناصر وحید کی والدہ مریم زمانی بیگم والئی لوہارو نواب امین الدین احمد خان (اوّل) کی صاحبزادی تھیں۔انہوں نے اپنی مذہبیت اور ثقافت دہلی کے مزاج کے مطابق اور خاص سیّدوں میں رشتہ داری کی خواہش کے زیر اثر خواجہ سید ناصر وزیر سجادہ نشین خواجہ میر دردؔ دہلوی کے نکاح میں دے دیا تھا۔یعنی نواب علاء الدین علائی کی بہن مریم زمانی بیگم نواب امیر الدین کی پھوپھی تھیں۔اسطرح خواجہ ناصر وزیر اور مریم زمانی کے بیٹے سید ناصر وحید اور نواب سر امیر الدین احمد خان سگے ماموں اور پھوپھی زاد بھائی تھے۔سیّدہ جمیلہ بیگم خواجہ ناصر وحید کی بیٹی تھیں۔ان سے نواب امیر الدین کی یہ اولادیں ہوئیں۔

صاحبزادے

مرزا ناصر الدین۔(چند ماہ بعد فوت ہوگئے)۔مرزا جمیل الدین عالیؔ۔مرزا جمال الدین۔ (یہ تین برس کے ہو کر فوت ہوگئے)۔

صاحبزادیاں

طاہرہ بانو بیگم۔نادرہ بانو بیگم

پانچویں شادی نواب سرامیرالدین نے اپنی ریاست کی ایک بیوہ خاتون "خانم صاحبہ" سے کی۔ان سے بھی دو بیٹے پیدا ہوئے۔ مرزا مراد (جو چند ماہ بعد فوت ہو گئے)، مرزا حمید الدین (یہ بھی پاکستان آ کر انتقال کر گئے)

نواب سرامیرالدین احمد خان نے اپنی بھرپور شاہانہ اور شاندار زندگی گزاری۔ ریاست سچین کے دورے میں بیمار پڑے۔ بمبئی میں ناکام علاج ہوا۔ دہلی آئے اور وہیں ۱۹ جنوری ۱۹۳۷ء میں وفات پائی۔

مسلم ریاستوں اور شمالی ہند کے بے حد نامور۔ مقبول اور بااقبال نواب سرامیرالدین احمد خان فرخ مرزا فرخی کا جنازہ ۲۰ جنوری کی صبح پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ریاست لوہارو کی فوج اور برطانوی ریذیڈنٹ متعین لاہور کے ساتھ لوہارو کے آبائی قبرستان تک پہنچایا گیا۔ توپیں چلائی گئیں اور ریاست لوہارو کے جھنڈے سرنگوں رہے۔

نواب اِعزالدین احمد خان اعظم مرزا

نواب اِعزالدین احمد خان اعظم مرزا ۲۷ دسمبر ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔ نواب سرامیر الدین احمد خان نے اپنے بڑے بیٹے اکبر مرزا کے انتقال کے بعد دوسرے فرزند اعظم مرزا کو لوہارو کا ولی عہد مقرر کیا۔ نواب اعظم مرزا بہت ذہین، حساس اور مدّبر تھے۔ عنان ریاست سنبھالنے کے بعد بہت حسن وخوبی سے ریاست کے تمام امور سرانجام دئے عالم جوانی ہی میں ادبی اور شاعرانہ فضا ملی اور استاد وحید الدین بیخود وشاگرد داغ دہلوی سے مشورہ کرتے۔ بہت اچھے شعر کہتے تھے ان کا مجموعہ کلام ''دیوان اعظم'' کے نام سے چھپا۔

نواب اعظم مرزا کا پہلا نکاح اپنے چچا نوابزادہ مرزا بشیر الدین کی صاحبزادی ذکیہ سلطان سے ہوا۔ مگر وہ عالمِ جوانی ہی میں داغِ مفارقت دے گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد دوسری شادی ذکیہ سلطان کی حقیقی بھتیجی خدیجہ سلطان بنت صاحبزادہ سام مرزا سے ہوئی۔ ذکیہ سلطان صاحبہ سے نواب اعظم مرزا کے چار فرزند اور تین صاحبزادیاں پیدا ہوئیں۔

فرزند۔

امین الدین احمد خان ثانی شہریار مرزا۔ نوابزادہ مرزا معین الدین احمد شہزاد

نوابزادہ مرزا اصلاح الدین احمد خان محشر (صاحب دیوان) تادم تحریر حیات۔

نوابزادہ مرزا محی الدین احمد خان شیر زماں

صاحبزادیاں۔

نوابزادی ارجمند بانو بیگم عرف اچھی بیگم ہز ہائی نس نواب حیدر علی خان والی پچین سے بیاہی گئیں۔
نوابزادی سعیدہ بانو عرف سروری بیگم (رئیس بیلا کوٹ (بمبئی) سے بیاہی گئیں) نوابزادی انوری بیگم۔ نواب خسرو مرزا کے صاحبزادے مرزا فرید الدین سے بیاہی گئیں۔ لاولد رہیں دوسری شادی مرزا صمصام الدین فیروز سے ہوئی۔

نواب اعظم کی صحت اوّل عمری ہی سے کمزور تھی۔ وہ عین عالم جوانی میں بیالیس سال کی عمر میں ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۶ء لوہارو میں انتقال کر گئے۔

نواب اعزالدین احمد خان اعظم مرزا والی لوہارو

نواب امین الدین احمد خان ثانی شہریار مرزا

نواب امین الدین احمد خان شہریار مرزا۔ دہلی میں ۲۳ مارچ ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم محلاتی ماحول میں ہوئی پھر لاہور میں اپچی سن کالج میں تعلیم حاصل کی۔ اپنے والد اعظم مرزا کی وفات کے بعد ان کی مسند نشینی ۱۱ جنوری ۱۹۲۷ء کو سولہ سال کی عمر میں ہوئی۔ مگر اختیارات بعد میں ملے اس دوران ان کے دادا نواب سر امیر الدین احمد خان ریاست کے ریجنٹ رہے۔ ۲۱ سال کی عمر میں گورنمنٹ نے نواب شہریار کو فرمانروا تسلیم کیا۔

تکمیل تعلیم کے بعد ۱۹۳۰ء تک انہوں نے جوڈیشل اور فوجی ٹریننگ جالندھر میں حاصل کی۔ نواب امین الدین احمد خان شہریار مرزا ایک تعلیم یافتہ روشن خیال اور ترقی پسند والی ریاست تھے۔ انہوں نے اپنی ریاست کی ترقی کیلئے بہت کام کئے۔ ریاست لوہارو کو بیکانیر اسٹیٹ ریلوے سے ملا کر ذریعہ سفر کی سہولت فراہم کی۔ ریلوے کا افتتاح ہز ہائی نس مہاراجہ سر گنگا سنگھ والی بیکانیر نے کیا۔ ریاست میں بجلی بھی ان ہی کے دور میں آئی۔ باقاعدہ اسکول اور ہسپتال بنوائے گئے۔

ہندوستان کی آزادی پر ان کی ریاست کا الحاق انڈین یونین سے کر کے اسکو مشرقی پنجاب میں ضم کر دیا گیا۔ جب مشرقی پنجاب بھی تقسیم ہوا تو لوہارو صوبہ ہریانہ کے حصے میں آیا۔ نواب شہریار مرزا کو جوانی ہی سے گھوڑے کی سواری شیر کے شکار اور ہوابازی کا شوق تھا۔ دہلی میں فلائنگ کلب کے ممبر رہے۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۶۲ء تک مستقل ہوابازی ان کا مشغلہ رہا۔ ٹینس پابندی سے کھیلتے تھے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۳ء تک صدر جمہوریہ کے اعزازی۔ اے۔ ڈی۔ سی

رہے۔ ۱۹۶۲ء میں چینی حملہ کے وقت انہوں نے اپنی خدمات حکومت کو پیش کی تھیں۔ ۱۹۶۸ء میں تجارہ چناؤ حلقہ سے راجستھان اسمبلی کے ممبر ہوئے۔ اور صوبائی حکومت میں وزیر تعمیرات عامہ پرنٹنگ پریس کے فرائض بہ حسن وخوبی انجام دیے۔

جنوری ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء تک ایگرو انڈسٹری کارپوریشن کے چیئرمین رہے۔ ۱۷ فروری ۱۹۷۷ء سے گورنر ہماچل پردیش کا عہدہ سنبھالا۔ جہاں بحیثیت گورنر پنجاب منتقل ہوئے۔ اور ۱۰ اپریل ۱۹۸۲ء کو ریٹائر ہوئے۔

نواب شہریار نے چار شادیاں کیں۔ پہلی شادی حیدرآباد دکن میں ایک قریبی عزیز نواب منظور جنگ کی صاحبزادی سعید بانو سے ہوئی۔ کچھ خانگی معاملات پر ان کو طلاق دیدی گئی۔ ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ دوسری شادی پہاسو کی شہزادی بیگم سے ہوئی۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادی ''ماہ بانو بیگم'' پیدا ہوئیں۔ تیسری شادی شہریار مرزا کی سگی چچازاد بہن صاحبزادی ''سارا سکینہ بانو بیگم'' سے ہوئی۔ ان سے ایک صاحبزادی ''شاہ بانو بیگم'' پیدا ہوئیں۔ چوتھی شادی جاورہ کی ایک خاتون صاحبزادی بیگم سے ہوئی۔ اور ان کے بطن سے ایک صاحبزادی ''نور بانو بیگم'' اور دو صاحبزادے مرزا علاء الدین، احمد خان پرویز، مرزا عماد الدین احمد خان درّو پیدا ہوئے

نواب شہریار مرزا جوانی میں ایک قابل حکمراں تھے۔ آزادی کے بعد درمیانی عمر میں سیاست، سیاحت اور فنونِ لطیفہ کی طرف زیادہ مائل ہوئے۔ ادبی ذوق ورثے میں پایا۔ اچھے شاعر ثابت ہوئے۔ فروری ۱۹۴۸ء میں انڈیا کی اور ریاستوں کے ساتھ ریاست لوہارو بھی ختم ہوگئی۔ مگر نواب شہریار کی تمام زندگی مفید کاموں میں گزری ۱۹۸۳ء میں وفات پائی۔ اور لوہارو کے خاندانی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

نواب امین الدین احمد خان ثانی شہریار مرزا والئی لوہارو

۱۹۵۴ء کراچی میں (وسط میں) نواب شہریار مرزا اف لوہارو (سیاہ کلاہ)
نواب سر احمد نواز خان اف ڈیرہ اسماعیل خان خاندان لوہارو کے ساتھ

احوال

نواب سرامیرالدین کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ بیگم سیّدہ جمیلہ بیگم اپنے دیور نوابزادہ ضمیر مرزا کی ہدایت پر تعلیم کی غرض سے اپنے بیٹے جمیل الدین عالی اور دو بیٹیوں طاہرہ بانو بیگم اور نادرہ بانو بیگم کے ساتھ لوہارو سے دہلی اپنے میکے رہائش پذیر ہوئیں جہاں بچوں نے اپنی ننہیال میں اپنے ماموں سید ناصر مجید کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت پائی ۱۹۴۷ء میں دہلی سے ہجرت کر کے اپنے بیٹے جمیل الدین عالی کے ساتھ کراچی میں قیام کیا۔ اپنی بڑی صاحبزادی طاہرہ بانو بیگم کی شادی کراچی میں غازی پور (انڈیا) کے زمیندار کنور رشید احمد خان سے کی جو لکھنو (انڈیا) میں ایک بڑے بزنس مین اور وسیع جائیداد کے مالک تھے۔ اور ہجرت کر کے پاکستان آ گئے تھے۔ ان سے طاہرہ بانو کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ محمد اکرام رشید، محمد عرفان رشید۔ دوسری صاحبزادی نادرہ بانو بیگم کی شادی کراچی میں نظام الدین نعمانی ولد عبدالرشید سجادہ نشین بوعلی شاہ قلندر پانی پتی سے ہوئی۔ نادرہ بانو کے چار بیٹے میجر محمد پناہ نعمانی، محمد امان نعمانی، ڈاکٹر محمد برہان نعمانی بار ایٹ لاء (امریکہ)، صلاح الدین نعمانی دو بیٹیاں عائشہ نعمانی اور فاطمہ نعمانی ہیں۔ نوابزادہ جمیل الدین عالی پاکستان کے نامور دانشور صحافی اور شاعر ہیں ان کے تین صاحبزادے مرزا ذوالقرنین راجو جمیل، مرزا نصیر الدین، مرزا مراد جمیل دو صاحبزادیاں حمیرا بانو بیگم، ربیعہ بانو بیگم پاکستان میں مقیم ہیں۔ اسطرح نوابزادہ جمیل الدین عالی، نوابزادی طاہرہ بانو بیگم اور نوابزادی نادرہ بانو بیگم۔ نواب سرامیرالدین کی صرف تین اولادیں تادم تحریر بقید حیات ہیں۔

لوہارو کے

اہل قلم

راقمہ نے ان دامادوں اور اولاد بنات کو بھی شامل کیا ہے
جنہوں نے تصنیف و تالیف میں نمایاں شہرت حاصل کی

نواب الٰہی بخش خان معروف

نواب الٰہی بخش خان معروف خاندانِ لوہارو کے پہلے معلوم شاعر ہیں نواب الٰہی بخش نواب احمد بخش خان والیٔ ریاست لوہارو کے بھائی تھے۔نواب معروف کو شعروادب سے بے حد لگاؤ تھا۔

مولانا محمد حسین آزاد اپنی کتاب ''آبِ حیات'' میں لکھتے ہیں۔کہ نواب الٰہی بخش خان معروف ایک صاحب دل بلند درجہ زاہد وعابد ہونے کے ساتھ ایک اعلیٰ قادر الکلام شاعر بھی تھے۔شعروسخن کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔استاد ذوق بہت ادب واحترام سے معروف کا تذکرہ کرتے تھے۔نواب الٰہی بخش معروف صاحب دیوان تھے۔اردو دیوان کے علاوہ پانچ سو بیت کی ایک مثنوی ''تسبیح زمرد'' بھی اپنی تصنیف چھوڑی ہے۔جو رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔نواب معروف کا ایک دیوان مرزا نصر اللہ خان صدر محاسب حکومت حیدر آباد دکن کی کوشش اور سرپرستی میں ۱۹۳۵ء میں نظامی پریس بدایوں میں شائع ہوا۔معروف کی داد ودہش کے تذکرے سے ''آب حیات'' کے کئی صفحے بھرے ہوئے ہیں نواب معروف بہت فیاض اور سخی تھے۔کوئی ان کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔نہایت مہمان نواز تھے۔نواب معروف کے زمانے میں دہلی علماء وصوفیاء کا مرکز بنی ہوئی تھی نواب الٰہی بخش معروف نے زہد وعبادت اور شاعری سے اپنے اجداد کا نام بھی روشن کیا۔وہ پاکیزہ نفس اور روشن ضمیر تھے۔چونکہ صاحب دل اور صاحب نسبت تھے۔آخری عمر میں خواجہ میر درد دہلوی کی طرز میں اپنا کلام کہنے لگے۔معروف کے زمانے میں مولانا فخر الدین دہلوی کے کمالات کا بڑا چرچا تھا۔ان کے روحانی فیوض بے شمار تھے۔معروف مولانا فخر الدین چشتی کے مرید خاص اور خلیفہ تھے۔نواب معروف نے علم وفضل اور تصوف کے

میدان میں شہرت پائی۔ان کا زیادہ کلام صوفیانہ ہے۔نواب الٰہی بخش خان معروف نے 80سال کی عمر ۱۲۴۲ھ میں وفات پائی۔اوراپنے ذاتی قبرستان حضرت محبوب الٰہی میں چونسٹھ کھمبہ میں مدفون ہیں۔

نمونہ کلام

اگرمنظور ہے پینا مے وحدت کے ساغر کا
لیا کرنام ہردم حضرت ساقی کوثر کا

علم کا اس کے اے معروف سرپرمیرے سایہ ہے
نہیں ہے ایک ذرہ غم مجھے خورشید محشرکا

بجز الحمد اللہ اہل دیں کا
کہاں منہ وصف رب العالمیں کا

کرم سے اس کے اپنے پر ہے نازاں
اثر فریاد دل ہائے حزیں کا

فقط اب ہم گنہگا روں کو معروف
بھروسہ ہے شفیع المذنبیں کا

....

سینے پر سو داغ کی دولت لئے جائیں گے ہم
مثلِ قاروں کچھ نہیں جائیں گے ہاں ہم چھوڑکر

....

گریۂ وآہ و فغاں سے ایک دم فرصت نہیں
ہم سمجھتے تھے محبت کام بے کاروں کا ہے

کچھ تو سمجھ لیا ہے جو اس کو دل دیا ہے
کیوں ناصحاعبث ہمیں سمجھائے جائے ہے

....

ہائے اس شوخ کایوں روٹھ کے جان معروف
اور کہنا کہ ہمیں اب نہ منائے کوئی

....

نواب مرزا خان داغ دہلوی

نواب مرزا خان۔ نواب شمس الدین احمد خان والی فیروز پور جھرکہ لوہارو کے صاحبزادے معروف ہیں۔ تخلص داغ تھا۔

۱۸۳۱ء کو دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم تھا جو محمد یوسف کشمیری سادہ کار کی نہایت حسین وجمیل بیٹی تھیں۔ ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدین احمد خان کو ریذیڈنٹ دہلی ولیم فریزر کے قتل کے سلسلے میں پھانسی کی سزا ہوئی۔ اس وقت داغ کی عمر ساڑھے چار سال کی تھی۔ ان کی والدہ داغ کو فیروز پور جھرکہ سے لیکر دہلی آ گئیں۔ داغ ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کی والدہ کا نکاح بادشاہ شاہ ظفر کے بیٹے مرزا فخرو سے ہوگیا۔ اسطرح داغ کو شاہی قلعے دہلی میں اپنی والدہ کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ وہاں کی فضاء میں نہ صرف اعلیٰ درجے کی شائستہ زبان بولنے کا موقع بلکہ علمی وادبی ماحول بھی میسر ہوا۔ لڑکپن ہی سے شعری ذوق پیدا ہو۔ اس وقت کے ماحول میں اکثر شہزادے اور خود بادشاہ ظفر شاہ بھی استاد ذوق کے شاگرد تھے داغ بھی ان کے شاگرد ہوئے۔ ذہین طبع تھے نوعمری ہی سے مقبولیت حاصل کی شہزادے مرزا فخرو کو زہر دیکر مار دیا گیا۔ مگر داغ قلعہ ہی میں رہے۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کے بعد دہلی سے نکلے۔ لاہور پہنچے۔ چند برس رامپور میں بھی ملازمت کی پھر حیدر آباد دکن میں نظام الملک میر محبوب علی خان کے استاد ہوئے جنہوں نے داغ کو فصیح الملک اور دبیر الملک کے خطابات سے نوازا۔ اگرچہ داغ نے پیشتر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر حقیقت میں وہ غزل کے شاعر تھے اور وہ اس صنفِ میں باکمال ہیں غزل اردو شاعری کی جان ہے اور داغ غزل کی آبرو، ذوق، غالب، مومن اور شفیقہ نے جو توانائی غزل کو عطا کی تھی۔ داغ نے اسے برقرار رکھا۔ داغ دہلوی
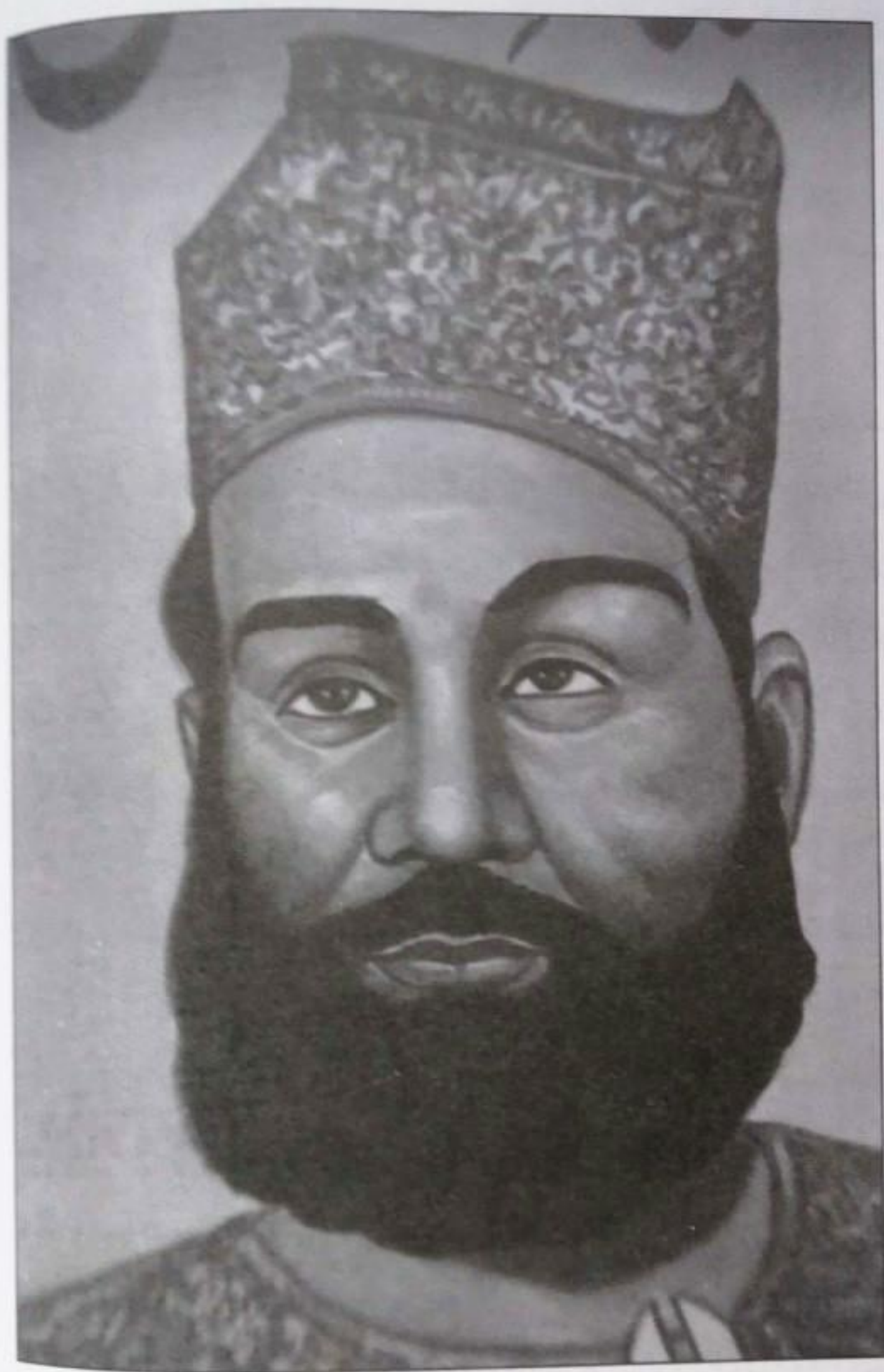
نواب مرزا خان داغؔ دہلوی

اپنی زبان پر نازاں تھے۔ وہ محض زبان و بیان اور لب ولہجہ کے شاعر نہیں۔ ان کے کلام میں انسانی نفسیات کے نازک پہلو بھی ہیں۔ ان کے مشاہدات اور وسیع تجربے نے ان کو پختہ کار بنادیا تھا۔ ان کی شاعری کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے ہزاروں اشعار ضرب المثل ہو کر زبان خاص و عام ہوئے۔ مثلاً

ع بہت دیر کی مہربان آتے آتے

ع بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

ع ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں۔

ع خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ع خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

ع صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔

داغ نے کئی دیوان مرتب کیے۔

۱۔ پہلا دیوان ۱۸۷۹ء میں گلزار داغ

۲۔ دوسرا دیوان ۱۸۸۴ء میں آفتاب داغ اور مثنوی فریاد داغ

۳۔ تیسرا دیوان ۱۸۹۲ء میں مہتاب داغ شائع ہوا۔

مرزا داغ نے اپنی خالہ زاد بہن سے شادی کی پھر ۱۸۷۱ء میں حج کی سعادت حاصل کی۔ داغ کے بے شمار شاگرد تھے۔ ان میں معروف عظیم نام شاعر مشرق علامہ اقبال۔ میر محبوب علی خان آصف نظام دکن، مولانا محمد علی جوہر، آغا شاعر دہلوی، بے خود دہلوی، نوح ناروی اور نواب سراج الدین سائل دہلوی قابل ذکر ہیں۔ داغ کی اپنی بھانجی اور منہ بولی بیٹی لاڈلی بیگم نواب سراج الدین سائل کو بیاہی ہوئی تھیں۔

۱۹۰۵ء میں عید البقر کو داغ نے حیدر آباد دکن میں انتقال کیا اور درگاہ یوسفین میں اپنی بیوی کے پہلو میں دفن ہوئے۔

نمونہ کلام

آدمی ہونا بہت دشوار ہے
پھر فرشتے حرصِ آدم کیا کریں

برائی نہ چاہے بروں سے نبھائے
اگر ہے تو دنیا میں مشکل یہی ہے

....

آدمی کو ہے یہی گوشۂ راحت کافی
گھر کرے دل میں جو انسان تو جنت کیا ہے۔

یارب ہے بخش دنیا بندے کو کام تیرا
محروم رہ نہ جائے کل یہ غلام تیرا

جب تک ہے دل بغل میں ہردم ہو یاد تیری
جب تک زباں ہو منہ میں جاری ہو نام تیرا

تو ہی ہے دینے والا پستی سے دے بلندی
اسفل مقام میرا اعلیٰ مقام تیرا

....

جلوے میری نگاہ میں کون ومکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

....

فلک زمین و ملائک جناب تھی دہلی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دہلی

....

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالبؔ

مرزا غالبؔ خاندانِ لوہارو کے پہلے شاعر نواب الٰہی بخش خان معروف کے داماد تھے۔ داماد لوہارو ہونے کے سبب خاندان لوہارو کے حوالوں میں ان کا ذکر کرنا ناگریز اور قابل فخر ہے۔ نواب الٰہی بخش خان کی بیٹی نوابزادی امراؤ بیگم کی شادی مرزا اسد اللہ خان غالبؔ سے ہوئی۔

مرزا غالبؔ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء (آگرہ) اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ قوم کے ایک ترک تھے اور اپنے نسب پر ہر جا بجا فخر کرتے تھے ان کے دادا کا نام قوقان بیگ۔ اور والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔ غالب کے والد کا نام عبداللہ بیگ۔ چچا کا نام نصر اللہ بیگ ایک بھائی یوسف مرزا اور ایک چھوٹی بہن خانم تھیں۔ نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ اوّل والئی فیروز پور جھرکہ ولوہارو کی ہمشیرہ مرزا نصر اللہ بیگ سے منسوب تھیں۔ نواب احمد بخش خان نے لارڈ لیک سے کہہ کر مرزا نصر اللہ بیگ کو انگریزی فوج میں رسالداری کا منصب دلوا دیا تھا۔ ان کی ذات اور رسالے کیلئے نواحی آگرہ کے دو پرگنے۔ سونک اور سونسا۔ مقرر کرائے۔ مرزا غالبؔ پانچ سال کے تھے کہ ان کے والد عبداللہ بیگ کو ایک جنگ کے دوران شہید کر دیا گیا۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے بھائی مرزا نصر اللہ بیگ نے ان کے بچوں کی پرورش کی۔ چونکہ مرزا نصر اللہ بیگ نواب احمد بخش خان والئی فیروز پور جھرکہ ولوہارو کی ہمشیرہ سے منسوب تھے۔ لہذا اسی وجہ سے مرزا غالبؔ کی شادی نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خان معروفؔ کی چھوٹی صاحبزادی نوابزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ غالبؔ کی شادی ۷ رجب ۱۲۲۵ھ میں تیرہ سال کی عمر میں ہوئی۔ نوابزادی امراؤ بیگم مرزا غالبؔ سے دو سال چھوٹی تھیں غالبؔ کو اپنی بیگم سے بہت محبت تھی۔ بیگم بھی شوہر کی راحت اور آرام پر جان قربان کرتی تھیں۔ مگر دونوں کی طرزِ زندگی میں بڑا فرق تھا۔ مرزا غالبؔ رند تھے اور
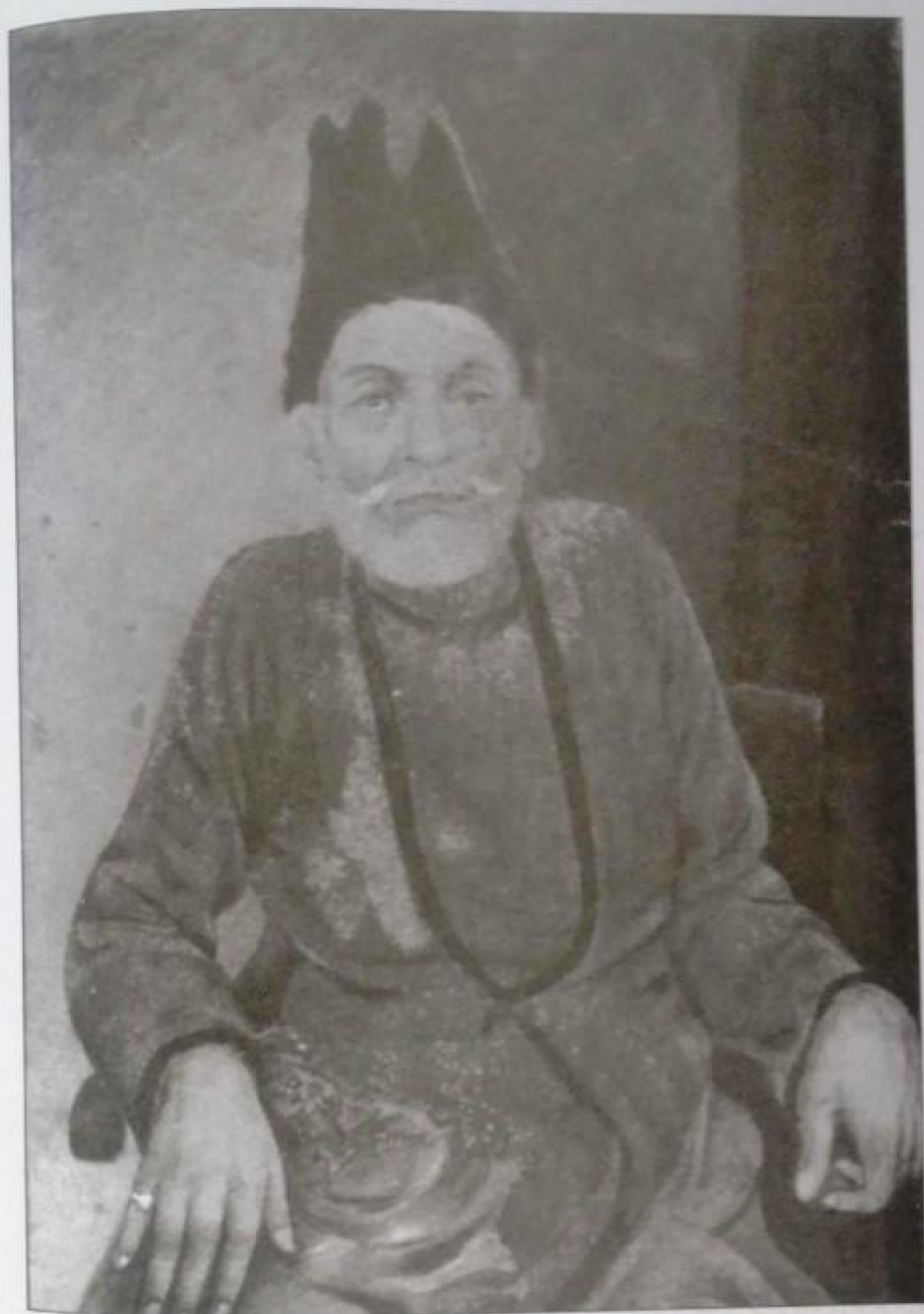
دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالبؔ

امراؤ بیگم بے حد نیک۔ عبادت گزار خاتون تھیں۔ حالی لکھتے ہیں۔ کہ امراؤ بیگم نے غالب کی شراب نوشی کے سبب اپنے کھانے پینے کے برتن الگ کر لئے تھے۔ اس کے باوجود دونوں میں محبت آخری دم تک رہی۔ مرزا غالب دن کا کھانا لازماً گھر میں کھاتے تھے۔ باہر سفر پر جاتے تو گھر کا پورا خیال رکھتے اور متواتر خطوط بھیجتے۔ غالب دوسرے رشتہ داروں اور دوستوں کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ دوستوں سے وفاداری ان کا ایمان تھا۔ غالب خوش رو اور خوش وضع کے مالک تھے۔ رکھ رکھاؤ نفاست پسند۔ اور نہایت خوش لباس تھے۔ بھاری قیمتی کپڑے کی قبا یا چغہ۔ سر پر کلاہ یا سیاہ پوستین کی اونچی ٹوپی اس کا نام ''پاپاخ'' تھا باہر جانے کا لباس تھا۔ صبح سویرے باداموں کا شیرہ۔ مصری شربت کے ساتھ گوشت کا سالن ان کی مرغوب غذا تھی۔ غالب ولایتی شراب پیتے تھے۔ ظرافت گھٹی میں پڑی تھی۔ غالب کی گفتگو میں علم زبان پر قدرت تخیل اور استقلال کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مرزا غالب رئیسوں کے رئیس تھے۔ بادشاہوں اور نوابوں کے استاد تھے۔ نوجوانی کے بعد عمر بھر قرضوں پر گزارہ کیا۔ غالب کا اپنا کوئی بچہ نہ تھا۔ ایک روایت کے مطابق سات بچے پیدا ہوئے۔ مگر کوئی بچہ پندرہ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ جب اولاد کی طرف سے مایوسی ہوئی تو انہوں نے اپنی سالی بنیادی بیگم کے بیٹے مرزا زین العابدین عارف کو اپنا بیٹا بنالیا۔ زین العابدین نے غالب کے گھر پرورش پائی۔ ادبی ذوق ورثے میں ملا۔ نوعمری ہی سے شعر کہنے لگے۔ عارف تخلص تھا۔ مگر عالم جوانی میں انتقال کر گئے۔ مرزا غالب کو ان کے انتقال کا بہت صدمہ ہوا۔ بڑھاپے میں شراب نوشی سے جسمانی قوت گھٹنے لگی۔ مالی پریشانیوں میں پنشن کی کمی۔ مصارف کی کثرت۔ جب تک نواب الٰہی بخش خان معروف اور نواب احمد بخش خان زندہ رہے۔ غالب کو کوئی مالی دقت پیش نہ آئی۔ غالب کی جو آمدنی ابتداء سے آخر تک مستقل رہی۔ وہ ان کی خاندانی پنشن تھی۔ ڈاکٹر مالک رام نے اپنی کتاب ذکرِ غالب میں لکھا ہے۔ کہ غالب اپنے فارسی کلام پر نازاں تھے۔ مگر غالب کی شہرت اور عظمت کا مدار غالب کا اردو دیوان ہے۔ غالب اردو شاعری میں اپنی عظمت کا سکہ بٹھا گئے۔ اردو شاعری کو فکر کی نئی جہات سے روشناس کرا دیا۔ کل جو انہوں نے کہا تھا وہ آج بھی دل کی بات لگتی ہے۔ غالب نہ صرف ایک باکمال شاعر ہیں بلکہ بہترین نثر نگار بھی۔ اردو نثر نگاری میں نثر کو بڑی بلندی تک

پہنچایا۔ انہوں نے زبان کی سادگی اور اظہار و بیان میں جو جدت پیدا کی وہ آج بھی نثر کا معیار سمجھی جاتی ہے۔ غالبؔ ایک آفاقی شاعر تھے۔ ان کی بے شمار تصانیف پاک و ہند کے اردو فارسی شاعروں اور ادیبوں میں زیادہ سوانحی اور علمی تحقیق و تشریح مرزا غالبؔ کی ہوتی ہے۔ اور برابر ہو رہی ہے ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنی کتاب انتخاب خطوط غالبؔ میں لکھتے ہیں کہ دہلی میں غالبؔ کو شعر و ادب کا ماحول ملا۔ نواب الہی بخش خان معروف ایک اچھے شاعر تھے۔ غالبؔ پر ان کا اثر ہوا۔ ان کی شخصیت حرکت اور عمل میں جو خصوصیت ملتی ہے وہ اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ غالبؔ نے وقتاً فوقتاً اپنے مختلف احباب کو جو خطوط لکھے ان میں ان کی شخصیت پوری طرح بے نقاب ہوتی ہے۔ غالبؔ نے اپنی سسرال یعنی خاندانِ لوہارو میں تقریباً اسی 80 خطوط لکھے۔ جس میں چھپن 56 خط اپنے چہیتے شاگرد نواب علاء الدین علائی کو لکھے۔ جن کا اس لحاظ سے نمبر منشی ہر گوپال تفتہ کے بعد آتا ہے۔ آخر ۵ فروری ۱۸۶۹ء کے مطابق سنین قمر کے حساب سے دوشنبہ کے دن شعر و ادب کا یہ درخشندہ آفتاب ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا۔ غالبؔ کی عمر تہتر 73 برس تین مہینے اور 23 دن۔ بحساب عیسوی اکہتر 71 برس ایک مہینہ اور 19 دن ہوتی ہے۔ دہلی دروازے کے باہر نماز جنازہ پڑھائی گئی اور حضرت شیخ نظام الدین رحمتہ اللہ علیہ کی درگاہ کے قریب لوہارو والوں کی ہڑواڑ میں اپنے خسر نواب الہی بخش معروف کے پہلو میں دفن ہیں۔ غالبؔ کی قبر پر ایک لوح نصب ہے۔ جس پر مولانا الطاف حسین حالیؔ کا یہ شعر کندہ ہے۔

رشک عرفی وفخر طالب مرد
اسد اللہ خان غالبؔ مرد

مرزا غالبؔ کی وفات کے بعد امراؤ بیگم غم و الم میں مبتلا رہیں اور عین مرزا غالبؔ کی پہلی برسی کے دن ۴ فروری ۱۸۷۰ء کو انتقال کر گئیں۔ غالبؔ کے مقبرے کی شرقی دیوار کے ساتھ دفن کیا گیا۔

خط

خط بنام نواب امین الدین احمد خان بہادر لوہارو کے نام

بھائی صاحب

ساٹھ ساٹھ برس سے ہمارے تمہارے بزرگوں میں قرابتیں بہم پہنچیں۔ نج کا میرا تمہارا معاملہ یہ کہ پچاس برس سے میں تم کو چاہتا ہوں بے اس کے کہ چاہت تمہاری طرف سے بھی ہو۔ چالیس برس سے محبت کا ظہور طرفین سے ہوا۔ میں تمہیں تم مجھے چاہتے رہے۔ وہ امر عالم اور یہ امر خاص کیا مقتضی اس کا نہیں کہ مجھ میں تم میں حقیقی بھائیوں کا سا اخلاص پیدا ہو جائے۔ وہ قرابت اور یہ مودت کیا پیوند خون سے کم ہے۔ تمہارا یہ حال سنوں اور بے تاب نہ ہو جاؤں اور وہاں نہ آؤں مگر کیا کروں۔ مبالغہ نہ سمجھو۔ میں ایک قالب بے روح ہوں۔

ع یکے مردہ شخصم بمردی رواں

اضمحلال روح روز افزوں ہے۔ صبح کو تبرید۔ قریب دوپہر کے روٹی شام کو شراب۔ اگر اس میں سے جس دن ایک چیز اپنے وقت پر نہ ملی۔ میں مرلیا۔ واللہ نہیں آسکتا۔ باللہ نہیں آسکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں۔ دوست نہ سہی، دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سہی۔ عداوت بھی تو نہ ہوگی۔ آج تم دونوں بھائی اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو۔ میں لم یلد ولم یولد۔ میری زوجہ تمہاری بہن میرے بچے تمہارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ہے۔ نہ تمہارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے

تمہارا دعا گو ہوں۔ اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے اور انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا کہ تم جیتے رہو اور میں تم دونوں کے سامنے مرجاؤں تاکہ اس قافلے کو اگر روٹی نہ دوگے تو چنے تو دوگے اور اگر چنے بھی نہ دوگے اور بات نہ پوچھو گے تو میری بلا سے میں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت ان فلک زدوں کے غم میں نہ الجھوں گا۔ جناب والدہ ماجدہ تمہاری یہاں آنا چاہتی ہیں اور ضیاء الدین خاں اسی واسطے وہاں پہنچے ہیں۔ سنو بعد تبدیل آب و ہوا دو فائدے اور بھی بڑے ہیں۔ کثرت اطباء محبت احبا تنہائی سے نہ ملول رہو گے۔ حرف و حکایت میں مشغول ہو گے۔ آؤ آؤ شتاب آؤ۔ بھائی علاؤ الدین خان تم کو کیا لکھوں۔ جو وہاں تمہارے دل پر گزرتی ہے۔ یہاں میری نظر میں ہے خیر دعائے مزید عمر و دولت۔ (نجات کا طالب غالبؔ)

خط بنام نواب علاء الدین احمد خان علائیؔ

حاجی مولانا علائیؔ

ساقی گر وظیفۂ حافظ زیادہ داد
کاشفتہ گشت طرہ ودستار مولوی

یہاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سراء کی دیواریں گر رہی ہیں پاخانہ ڈھے گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمہاری پھوپھی کہتی ہیں ہائے دبی، ہائے مری، دیوان خانے کا حال محل سراء سے بدتر ہے میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت بھی میں بیٹھا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپھی کو رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی۔ مرمت ہو جائیگی پھر میں اور میم صاحب اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں۔ ایک یہ مروت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی۔

غالبؔ

انتخاب خطوط غالبؔ، ڈاکٹر عبادت بریلوی۔

میم صاحب۔ بیگم امراؤ
بابا لوگ۔ عارف کے بچے۔

خط

خط بنام مرزا امیر الدین احمد خان فرخ مرزا

اے مردم چشم جہاں بین غالب !

پہلے القاب کے معنی سمجھ لو یعنی ''چشم جہاں بین'' غالب کی پتلی۔ چشم جہاں بین، تمہارا باپ مرزا علاؤ الدین خاں بہادر اور پتلی تم۔ آج میں نے تمہارا خط دیکھا۔ مجھ کو بہت پسند آیا۔ استاد کامل نہ ہونے کے باوصف تم نے یہ کمال حاصل کیا۔ آفریں صد آفریں! میں اپنے اور تمہارے پروردگار سے کہ وہ رب العالمین ہے یہ دعا مانگتا ہوں کہ وہ تم کو زیادہ نہیں تو تمہارے باپ کے برابر علم و فضل اور تمہارے پردادا حضرت فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر جنت آرام گاہ کے برابر جاہ و جلال عنایت کرے۔

میاں تمہارے دادا نواب امین الدین خان بہادر ہیں۔ میں تو تمہارا دلدادہ ہوں خبردار ہر جمعے کو اپنی صورت مجھے دکھا جایا کرو۔ والدعا۔

دیدار کا طالب۔ غالب

مرزا زین العابدین عارف

مرزا زین العابدین عارف ۱۲۳۳ھ کو پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ ان کی والدہ نوابزادی بنیادی بیگم نواب الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی اور مرزا غالبؔ کی سالی تھیں۔ عارف کی تعلیم و تربیت مرزا غالب کی نگرانی میں ہوئی۔ 21 سال کی عمر میں عارف کی شادی نواب بیگم بنت نواب احمد بخش خان رئیس فیروز پور جھرکہ ولوہارو سے ہوئی۔ نواب بیگم بچہ پیدا ہونے کے بعد زچگی ہی میں فوت ہو گئیں مگر لوہارو سے زین العابدین کو ڈھائی سو روپے ماہوار وظیفہ تا زیست ملتا رہا۔ اس کے بعد عارف کا دوسرا نکاح محمد علی بیگ بخارائی کی صاحبزادی بسنتی بیگم سے ہوا۔ زین العابدین عارف کو مرزا غالب نے اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ عارف بچپن ہی سے بہت ذہین تھے غالبؔ کی صحبت میں پرورش پائی۔ ادبی ذوق ورثے میں ملا۔ نوعمری ہی سے شعر کہنے لگے۔ عارف کی فطری صلاحیت کو غالب نے خوب نکھارا عارف اپنی غزلیں غالب کے رنگ میں کہتے تھے۔ انہوں نے کم عمری میں اپنے دو دیوان مرتب کئے۔ اردو، فارسی، دونوں میں اشعار کہتے مگر فارسی میں ان کا کلام زیادہ ہے۔ سر سید احمد خان نے اپنی کتاب ''آثار الصنادید'' میں عارف کے باکمال ہونے کی تعریف کی ہے۔ عارف نے بزرگان دین کی شان میں سلام اور منقبت کہے۔ عارف بیمار ہوئے۔ موت سے چند روز پہلے جب غالب ان کی عیادت کو گئے تو عارف نے یہ شعر کہا۔

آنکھوں میں دم ہے مثل چراغ سحر ہوں میں
لو لگ رہی ہے جان کو کیا انتظار ہے۔

عارفؔ کے انتقال پر مرزا غالبؔ نے وہ دردناک نوحہ لکھا جو اردو نظم کی تاریخ میں بے مثال ہے۔ (تنہا جو گئے اب رہو تنہا کوئی دن اور) عارفؔ کا مزار اپنے نانا نواب الہی بخش خان معروف کے قبرستان میں مرزا غالبؔ کی پائینتی ہے۔

نمونہ کلام

مدت ہوئی ہے عیش کا سامان کئے ہوئے
روشن چراغ مہ سے شبستان کئے ہوئے

صبح ہجراں کی مصیبت جو یہ ہوتی معلوم
میں شب وصل کی ہر گز نہ تمنا کرتا

چین اک دم نہیں بیتائی دل سے عارفؔ
کس نے رکھ دی ہے میرے سینے کے اندر بجلی

سب سے بہتر ہے کہ مجھ پر مہرباں کوئی نہ ہو
ہم نشیں کوئی نہ ہو اور راز داں کوئی نہ ہو

کیوں ہمیں دیکھنے گھبرا کے تم آئے صاحب
تم تو کہتے تھے محبت میں اثر خاک نہیں

بادشاہی پہ ہو مغرور کوئی کیا عارفؔ
نہ وہ چنگیز نہ وہ شوکتِ چنگیز رہی

مرزا باقر علی خان کامؔل

مرزا باقر علی خان ۔نواب زین العابدین عارفؔ کے بیٹے تھے۔ عارف کے انتقال کے بعد مرزا غالبؔ نے باقر علی کو بہت محبت اور لارڈ سے پالا۔ مرزا غالبؔ کی صحبت میں علمی وادبی ماحول ملا۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق ہوا۔ مرزا باقر علی کی شادی 17 سال کی عمر میں نواب ضیاء الدین احمد خان نیرؔ رخشاں کی صاحبزادی معظم زمانی عرف بگا بیگم سے ہوئی۔ شادی کے بعد ریاست الور کے رئیس مہاراجہ شیودان سنگھ کی فوج میں کپتان کے عہدے پر فائز ہوئے۔ فنون سپہ گری میں ماہر تھے اور شیر کا شکار برچھے سے کرتے تھے۔ باقر علی خان کامل تخلص کرتے۔ فارسی اردو دونوں میں شعر کہتے۔ فارسی کلام میں باقر اور اردو میں کامل۔ سالک سے کلام میں اصلاح لیتے تھے۔ کامل نے نہایت شاندار زندگی گذاری۔ ادیبوں اور شاعروں کی بہت عزت کرتے تھے۔

نمونہ کلام

قطعہ

مژگاں سے گر بچے دل ابرو کرے ہے ٹکڑے

یہ بات میں نے کہہ کر جب اس سے داد چاہی

کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہووے خالی

تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

(تذکرہ گلشن بے خار سے نواب مصطفےٰ خان شیفتہ)

اٹھانے پڑینگے نہ ساقی کے ناز
کہ پیر مغاں آشنا ہو گیا

کاملؔ دعا کرو کہ پھر اگلی ہی شکل سے
ہم حال دل کہا کریں اور وہ سنا کریں۔

(خمخانۂ جاوید سے خورشید احمد خان یوسفی)

نواب ضیاء الدین احمد خان نیّر رخشاں

نواب ضیاء الدین احمد خان نیّر رخشاں۔نواب احمد بخش خان والی ریاست لوہارو۔فیروز پور جھرکہ کے صاحبزادے تھے۔فیروز پور جھرکہ میں پیدا ہوئے۔گھر پر ہی اتالیق سے نہایت اعلیٰ تعلیم وتربیت پائی۔علم تفسیر وحدیث وفقہ، ادب، فارسی، اردو سب میں مہارت حاصل کی۔لوہارو چھوڑ کر مستقل سکونت دہلی میں اختیار کی۔نواب ضیاء الدین کا نکاح شرف الدولہ نواب قاسم جان کی پوتی اور مرزا قدرت اللہ خان کی صاحبزادی امتیاز زمانی بیگم سے ہوا۔اولاد میں ایک صاحبزادی معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم دو صاحبزادے شہاب الدین ثاقب اور احمد سعید خان طالبؔ تھے۔کتب بینی ان کا خاص مشغلہ تھا۔فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے فارسی میں نیّر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔علم نجوم میں بھی ماہر تھے مرزا غالبؔ نے ان کی تعلیم وتربیت میں بہت دلچسپی لی۔فن تاریخ میں بھی ماہر سمجھے جاتے تھے۔مرزا غالبؔ کے محبوب شاگرد تھے۔غالبؔ کو اپنے شاگرد پر فخر تھا۔غالبؔ نے اپنی زندگی میں ضیاء الدین نیّر۔رخشاں کو سندِ خلافت لکھ کر عنایت کی۔اور ان کی مدح میں ایک قصیدہ بھی کہا ہے۔نیر۔رخشاں نے دیوان غالب اردو کا مقدمہ بھی لکھا تھا ضیاء الدین نیر رخشاں بڑی صفات کے مالک تھے۔ان کا علم وفضل تمام ہندوستان میں مسلم تھا۔نہایت وضع دار۔مہمان نواز اور شاہانہ شکوہ کے مالک تھے۔۱۸۵۷ء کے غدر میں ان کا علمی سرمایہ ضائع ہوگیا مگر غدر کے بعد پھر انہوں نے علمی سرمایہ جمع کیا۔جب حکومت ہند کے سکریٹری ایلیٹ نے اپنی مشہور تاریخ لکھی تو نواب ضیاء الدین نے ان کو کتب فراہم کیں۔جس کا اعتراف ایلیٹ نے اپنی کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔۱۸۵۰ء میں نواب ضیاء الدین نے دہلی کی آثار قدیمہ کی سوسائیٹی میں ایک لیکچر دیا جس میں انہوں نے تاریخی

واقعات سے یہ ثابت کیا تھا کہ دلّی کا قطب مینار مسلمانوں ہی کا بنوایا ہوا ہے۔ نواب ضیاء الدین نیرّ رخشاں نے مختصر علالت کے بعد ۱۸۸۵ء میں رحلت فرمائی۔ دہلی میں بمقام مہرولی حضرت بختیار کاکیؒ کی درگاہ میں اپنی خرید کردہ مرزا بابر والی کوٹھی میں دفن ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے نواب سعید الدین طالبؔ نے ان کا دیوان ''صحیفۂ زرین'' نیرّ رخشاں کے نام سے شائع کرایا۔ اس موقع پر حالی نے یہ رباعی کہی۔ جو لوح قبر پر کندہ ہے۔

رباعی

غالبؔ ہے نہ شیفتہ نہ نیر باقی
وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزم یاراں سمجھو
یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

نمونہ کلام

بوالہوس اور بھی مرنے کی کریں گے خواہش
لے کے گل قبر پہ رخشاں کی نہ آیا کیجئے

غزل

لے خبر میری، کہ اب غم کی مجھے تاب نہیں — آدمی ہوں نہ فلک، گرچہ خور وخواب نہیں
آنکھ سے نکلے تو پھر جذب ہوئے دامن میں — بجز اشکوں کے کوئی گوہر نایاب نہیں
ہم ہی جب تھک چکے، پھر کیا ہمیں پروائے جہاں — نکل اے نالہ کہ اس ضبط کی اب تاب نہیں
اے دل شاد الگ ہو میرے سینے میں نہ رہ — تجھ کو معلوم عزاخانے کے آداب نہیں

مے کے گرنے کا ہے خیال ہمیں — ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر — گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں
نقص سے رنج کچھ نہیں، رخشاں — حق نے بخشا ہے یہ کمال ہمیں

نواب مرزا ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں

مرزا شہاب الدین احمد خان ثاقبؔ

مرزا شہاب الدین احمد خان۔نواب ضیاء الدین نیر رخشاں کے بڑے بیٹے تھے ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے۔شہاب الدین نے نہایت اعلیٰ تعلیم و تربیت پائی۔ان کی شادی ان کے سوتیلے چچا نواب شمس الدین احمد خان کی نواسی سکندر جہاں بیگم سے ہوئی۔اور پانچ بیٹے پیدا ہوئے۔مرزا شہاب الدین نے اپنے والد سے علم و فضل حاصل کیا۔ادبی ذوق ورثے میں ملا اپنی ذہانت اور ذوق کے سبب مرزا غالب کے محبوب شاگرد بنے۔مرزا غالب نے ہی ان کا تخلص ثاقب عطا کیا تھا۔ثاقب نے میدان ادب میں خوب شہرت و عزت حاصل کی۔ثاقب نہایت منتظم اور خوش اخلاق تھے۔ان کی انتظامی قابلیت سے انگریز حکومت نے ان کو دہلی کا آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا تھا۔ثاقب کے کلام میں مضمون آفرینی اور زبان کی چاشنی ہے۔افسوس عمر نے وفا نہ کی اور مرزا غالب کی وفات کے دو ہی مہینے بعد 29 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ان کی وصیت کے مطابق قدم شریف دہلی میں دفن کیے گئے۔

نمونہ کلام

غزل

فکر وصال و ہجر کے صدمے اٹھایئے — اس چند روزہ زیست میں کیا کیا اٹھایئے

بیٹھے ہیں ہم تو اب دل بے آرزو لیے — وہ دن گئے کہ داغ تمنا اٹھایئے

ثاقبؔ وہ ضبط عشق کو سمجھے ہیں بے غمی — یہ رویئے کہ شورش دریا اٹھایئے

بیٹھے ہیں ہم تو اب دل بے آرزو لیے — وہ دن گئے کہ داغ تمنا اٹھایئے

نواب سعید الدین احمد خان طالبؔ

نواب سعید الدین احمد خان۔ نواب ضیاء الدین نیرؔ رخشاںؔ کے بیٹے تھے۔ ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت اپنے والد کی نگرانی میں نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی۔ ان کی شادی بادشاہ بیگم دختر آغا سعید احمد شاہ نواب سردھنہ سے ہوئی۔ کوئی اولاد نہ ہوئی ذوق شعر ادب ورثے میں ملا اور نوعمری میں شعر کہنے لگے۔ طالبؔ تخلص رکھا اور اپنے والد کے کہنے پر مولانا حالیؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ طالبؔ اردو اور فارسی دونوں اصناف سخن میں شعر کہتے۔ ان کے شعر پڑھنے کا انداز دلاویز تھا۔ اکثر مرثیہ بھی کہتے تھے۔ دلّی میں ان کے یہاں کی مجلسوں کی بڑی شہرت تھی اپنے دور کے نامور اور باکمال شاعر تھے۔ ”خمخانۂ جاوید“ پر طالب نے جو تقریظ لکھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لغات اور زبان کے بارے میں بھی ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ فارسی زبان بھی مادری زبان کی طرح بولتے تھے۔ نہایت خوبرو تھے اور دلّی والے ان کو یوسف ثانی کہتے تھے۔ حسن صورت کے ساتھ حسن گفتار بھی لاجواب تھا۔ فصاحت ان کے کلام کی نمایاں خوبی ہے۔ طالبؔ نہایت ماہر شہ سوار تھے۔ گھوڑے کو الف کر کے پچھلی دو ٹانگوں پر دور تک چلاتے تھے۔ ان کے اصطبل میں بہترین نسل کے گھوڑے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں لیفٹنٹ گورنر پنجاب مسٹر اجرٹن نے نواب طالبؔ کو ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر دہلی مقرر کیا۔ اور انہوں نے دس سال تک نہایت خوبی سے اپنے فرائض انجام دئے۔ نواب طالبؔ کو پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ لوہارو سے بھی ملتا تھا۔ اپنے والد نواب ضیاء الدین نیرؔ رخشاںؔ کے انتقال کے بعد دہلی کی جائیداد کا انتظام بھی انہوں نے ہی سنبھالا۔ ان کا انتقال ۱۹۲۰ء میں یکایک حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوا۔ حسب وصیت اپنے والد کی پائیتی قطب صاحب دہلی میں دفن ہوئے۔ ان کی قلمی بیاض کتب خانہ لوہارو میں تھی جو اب رضا لائبریری رامپور (انڈیا) میں ہے۔

نمونہ کلام

المختصر کہ خادم شاہ نجف ہیں ہم
مشکل کشا ہیں جن کے سلف وہ خلف ہیں ہم

رخ سے اٹھایا بزم میں اس نے نقاب کو
شوخی نے کچھ بڑھا دیا لطف حجاب کو

اپنے بیگانے ہوئے سب لطف ساقی دیکھ کر
پھر گیا ہم سے زمانہ گردش ساغر کے ساتھ

ترے ساتھ تھے دل کے ارمان سارے
نہیں جب سے تو کوئی ارماں نہیں ہے

طالبؔ کی لو خبر کہ وہ بیمار ناتواں
دنیا میں کوئی دم کیلئے مہماں ہے اب

مرزا حسین علی خان شاداںؔ

مرزا حسین علی خان۔ نواب زین العابدین عارف کے چھوٹے بیٹے تھے۔ عارف کے انتقال کے وقت حسین علی کی عمر دو سال تھی۔ مرزا غالب کی بیگم امراؤ بیگم نے حسین علی کو بہت محبت سے پالا۔ حسین علی کی پرورش مرزا غالب کی نگرانی میں ہوئی۔ علمی وادبی ماحول میں آنکھ کھولی تو کم سنی ہی سے شعر گوئی کی عادت پڑی اردو میں شاداں اور فارسی میں خیال تخلص کرتے تھے۔

بہت اچھے شاعر تھے۔ اپنے کلام پر کبھی مرزا غالب اور کبھی سالک سے اصلاح لیتے۔ شوخی، شگفتگی اور روزمرہ محاورے ان کی شاعری کی نمایاں صفات ہیں۔ افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور جوانی ہی میں دلّی میں انتقال کر گئے۔ حضرت محبوب الٰہی کی پائیتی اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔

نمونہ کلام

غزل

ہے رنگِ عشق رخ سے عیاں دیکھ لیجئے ــــ یہ دردِ دل نہیں کہ سنایا نہ جائے گا

آیا ہوں در پہ دور سے در تک تو آؤ تم ــــ کیا دو قدم بھی آپ سے آیا نہ جائے گا

شاداں نے دل لگا کے بتو سے برا کیا ــــ اس سے یہ رازِ عشق چھپایا نہ جائے گا

تری ہر ادا پہ مرتا ترے ہر سخن پہ جیتا ــــ مجھے موت و زندگی پر اگر اختیار ہوتا

مرزا امتیاز الدین مائلؔ

مرزا امتیاز الدین مائل۔ نواب شہاب الدین ثاقب کے چھوٹے اور چوتھے بیٹے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی شادی داغ کی بھانجی اور منہ بولی بیٹی لاڈلی بیگم سے ہوئی۔ مرزا داغ کا داماد ہونے کی حیثیت سے حیدر آباد دکن سے وظیفہ بھی ملتا تھا۔ انگریزی حکومت میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر رہے۔ مائل کو شعری ذوق ورثے میں ملا۔ مزاج شاہانہ اور لاابالی طبیعت تھی۔ تفریحاً شاعری کرتے تھے۔ اپنے کلام کی اصلاح نواب علاء الدین علائی سے لیتے تھے۔ طبیعت غزل کی طرف مائل تھی۔ اچھے اشعار کہتے تھے۔ مگر عمر نے وفا نہ کی اور ۲۹ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ایک صاحبزادے مرزا ناصر الدین چھوڑے۔ مائلؔ کی وفات کے بعد مرزا داغ نے اپنی منہ بولی بیٹی کی شادی اپنے شاگرد نواب مرزا سراج الدین سائل سے کر دی۔

نمونہ کلام

شاعری ہے اس کا حق سب جانتے ہیں اہلِ بزم
لوگ کہتے ہیں کہ مائل بھی سخنور ہو گیا

گر نہ نواب علائی کو دکھاتا وہ غزل
عمر بھر بھی کبھی مائل نہ سخنداں ہوتا

نواب مرزا سراج الدین سائل

نواب مرزا سراج الدین سائل ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ مرزا شہاب الدین ثاقب کے بیٹے اور نواب ضیاء الدین احمد نیر رخشاں کے لاڈلے پوتے تھے۔ سائل کی شادی اپنی بیوہ بھاوج لاڈلی بیگم سے ہوئی۔ جو مرزا داغ کی منہ بولی بیٹی تھی۔ ان سے سائل کے تین بچے پیدا ہوئے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔

نواب سائل نے جاہ وحشم میں آنکھ کھولی۔ علم وادب ورثے میں ملے اپنے بھائیوں سے زیادہ ذہین طبع تھے۔ لڑکپن سے روزانہ شام کو اپنے دادا نواب ضیاء الدین احمد نیر رخشاں کے دیوان خانے میں جاتے جہاں مشاہیر علم وادب جمع ہوتے تھے۔ اور ہر علمی وادبی موضوع پر گفتگو ہوتی تھی۔ اس علمی فضاء نے ان کے ذہن کو جلا بخشی اپنے ذوق شعروادب سے مشکل زمین میں شعر کہنے لگے۔ مرزا سائل نہایت خوش رو خوش وضع، خوش گلو اور وجیہ شخصیت کے مالک اور قدیم تہذیب کا مکمل نمونہ تھے۔

نوعمری ہی سے سائل کی شاعری کا ڈنکا ہندوستان میں بجنے لگا سائل کا کلام سنانے کا انداز بھی بڑا دل نشین تھا۔ جس مشاعرے میں جاتے مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ تمام اصناف سخن میں شاعری کی مگر غزل کی طرف زیادہ مائل رہے یوں تو غالب اور مومن بھی لحن سے مشاعرہ پڑھتے مگر ایک روایت کے مطابق باقاعدہ ترنم سے پڑھنے کی ابتدا نواب سائل نے کی تھی۔ سائل اپنے کلام میں زبان اور سادگی بیان پر خاص توجہ دیتے تھے۔ مجموعی طور سے اردو فن شاعری کی پختگی اور مہارت ان کا کلام کی نمایاں خوبی ہے۔ سائل کو فارسی پر بھی عبور حاصل تھا۔ وہ ایک کامیاب اور

مشہور شاعر تھے۔ اپنے دیوان کے علاوہ ایک طویل مثنوی (تقریباً بارہ ہزار اشعار) ''نورِ اعلیٰ نور'' لکھی تھی جو غیر مطبوعہ رہی۔ غزل کے استاد تھے آخری عمر میں سائل کی کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ معذور ہو گئے ۸۱ سال کی عمر میں ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو انتقال ہوا۔ اور اپنی خاندانی ہڑواڑ صندل خانے میں دفن ہوئے۔

نمونہ کلام

غزل

مجھے یاد کرنے سے یہ مدعا تھا
نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے
پکڑ لائے سائلؔ کو بزمِ سخن میں
بنی اس کے دم پر یہاں آتے آتے

تجھے نواب بھی کہتے ہیں شاعر بھی سمجھتے ہیں
زمانے میں ترا سائلؔ بھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ مسجد ہے یہ میخانہ تعجب اس پہ آتا ہے
جنابِ شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

میں نے حسیں جان کے تم کو کہا تھا بت
تم ایسے روٹھے روٹھ کے پتھر کے ہو گئے
واللہ شعر و سخن مدت سے ہوں
روشناس ایں و آں شہرت سے ہوں
ہوں نبیرہ نیرؔ و رخشاںؔ کا میں
خوشہ چین نواب مرزا خاں کا میں
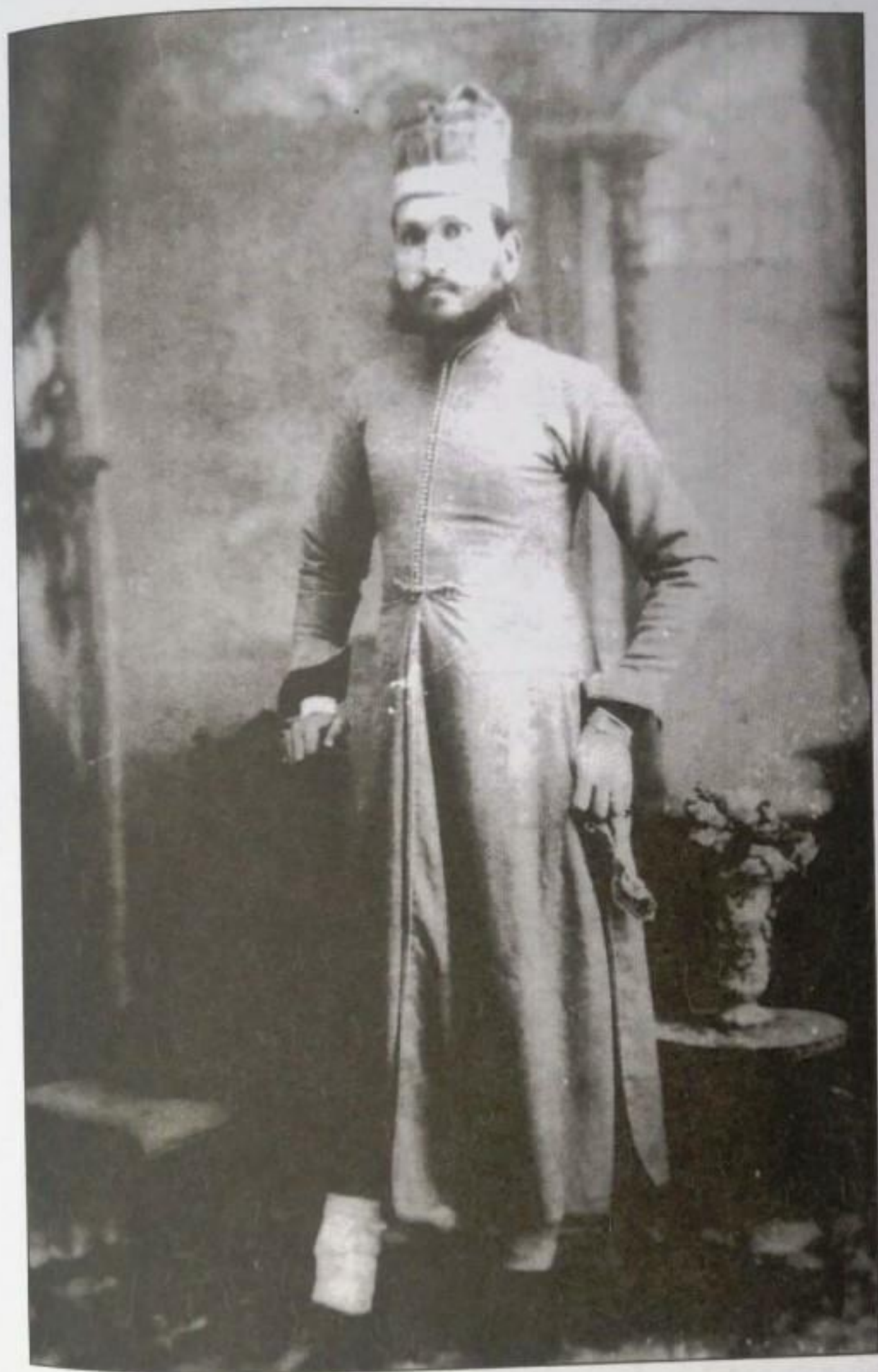
نواب مرزا سراج الدین سائلؔ

یعنی وہ جس کا تخلص داغؔ تھا
ہمنوائے عندلیب و باغ تھا۔

غزل

کس قدر ہوتا ہے درد انگیز انداز غزل
روح پرور، جاں فزا، انجام و آغاز غزل
ہوش کھو دیتا ہے مردِ پر خرد کا اس کا جوش
چھیڑ دیتا ہے کہیں کوئی اگر سازِ غزل

از مثنوی ''نوراً علی نور'' سے

حمدِ باری تعالیٰ

تیری حمد و ثنا لکھتا ہے روز و شب قلم میرا
الٰہی خوب بدلا تونے عنوانِ قلم میرا
سنا تھا نام تیرا ہی ہوا تھا جب جنم میرا
وہی ورد زباں جب بھی رہے جب نکلے دم میرا
زمانہ زندگی کا گور کی مدت یہ احساں ہے
شب راحت سے کم رکھا ہے تونے روز غم میرا
تخلص ہے میرا سائل سمجھتے ہیں مجھے کامل
نزولِ رحمتِ باری سے ہے بھاری بھرم میرا
یہ مے خواروں کو سمجھانے کے دن ہیں ؟
کسی کے ہوش میں آنے کے دن ہیں ؟
نہ ہو پابند زنداں کوئی وحشی
بہار آئی ہوا کھانے کے دن ہیں

مرزا شجاع الدین احمد تاباںؔ

مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کے بیٹے اور نواب ضیاء الدین نیر رخشان کے پوتے تھے۔ ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی شادی باقر علی کامل کی صاحبزادی محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم سے ہوئی۔ تاباں نہایت وجیہ شخصیت، زندہ دل خوش مزاج اور خاندانی شرافت کا نمونہ تھے۔ ان کی سخاوت مشہور تھی کوئی ان کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا تھا۔ تاباں کی اپنی ذاتی جائیداد کے علاوہ ریاست لوہارو سے بھی ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ اسلئے ان کو کبھی فکرِ معاش نہ ہوئی۔ شعروادب کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ ادبی ذوق ورثے میں پایا۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے۔ تاباں کے کلام میں کسی قدر مرزا غالب کا رنگ تھا۔ اکثر اردو میں منظوم کلام کہتے۔ گھوڑے کی سواری کرنا اور شطرنج کھیلنا ان کے محبوب مشاغل تھے۔ ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔ اپنی خاندانی ہژواڑ صندل خانے میں دفن ہوئے۔

نمونہ کلام

نہیں ہے دوست اپنا یار اپنا مہرباں اپنا
سناؤں کس کو غم اپنا الم اپنا بیاں اپنا

مجھے آتا ہے رونا ایسی تنہائی پہ اے تاباں
نہ یار اپنا نہ دل اپنا نہ وہ جان جہاں اپنا

نیر و غالب کا تاباں تو ہی ہے زلہ ربا
تجھ سے ذرّے پر شعائیں ان کی تاباں ہو گئیں

نواب سید میر احمد شفیع نیّر فرید آبادی

نواب سید میر احمد شفیع نیر ۱۸۶۸ء کو بمقام فرید آباد نواح دہلی میں پیدا ہوئے۔ نیر کی شادی ریاست لوہارو کے نواب علاء الدین علائی کی صاحبزادی نوابزادی رضیہ بیگم سے ہوئی۔ سید شفیع نیر نہ صرف اردو، فارسی کے نامور شاعر بلکہ ایک اچھے انشاء پرداز بھی تھے۔ نیر فرید آباد کے رئیس جاگیر دار تھے۔ انہوں نے علم و ادب کی دنیا میں بڑا نام پایا۔ انہیں فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ خواجہ حسن نظامی بستی نظام الدین دہلی سے ان سے فارسی پڑھنے اور اپنے مضامین کی اصلاح لینے آتے تھے۔ نیر ایک ماہوار رسالہ ''تہذیب'' بھی نکالتے تھے جسمیں اکثر ان کے مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ ان کا ایک ناول ''کنولا'' بہت مشہور ہوا۔ سید شفیع نیر کا گھر علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ ۱۴ مارچ ۱۸۸۹ء میں ان کی شادی نواب علاء الدین علائی کی صاحبزادی نوابزادی رضیہ بیگم سے ہوئی۔ رضیہ بیگم نے علمی ذوق ورثہ میں پایا تھا حافظ سعدی اور امیر خسرو کے ہزاروں اشعار ان کو یاد تھے۔ ان شعراء کا کلام وہ نہایت ذوق وشوق سے پڑھتی تھیں۔ یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ ایک تاریخی شادی تھی۔ لوہارو میں بارات میں باراتی اسقدر تھے کہ ایک شہر بس گیا تھا۔ بارات نے پندرہ دن لوہارو میں قیام کیا۔

جہیز میں رضیہ بیگم کو بہت کچھ ملا مگر ساتھ میں ایک ہتھنی بھی ملی۔ جو فرید آباد میں قاسم گنج میں رہتی تھی۔ ایک فیل بان اور دوسرا ملازم بھی تھا۔ روایت ہے کہ یہ ہتھنی چلم پیتی تھی اس کے لئے ایک خاص بڑی چلم بنتی تھی۔ چلم اور تمباکو کے لئے الگ کمرہ تھا۔ سید شفیع نیر نہایت مہمان نواز اور ادب نواز تھے۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم میں ہند کی تباہی میں فرید آباد بھی زد میں آ گیا۔ اور شفیع نیر کا تمام علمی سرمایہ اور کتب خانہ برباد ہوگیا۔

نواب سید میر احمد شفیع نیرؔ فرید آبادی
اپنے صاحبزادوں سید مطلبی اور ہاشم علی کے ساتھ

سید شفیع نیر نے ۱۹۰۶ء میں وفات پائی۔ فرید آبادی میں تدفین ہوئی۔ ان کے بعد نوابزادی رضیہ بیگم نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانے پر کی۔ ان کے سب فرزند بھی عالم فاضل بھی ہوئے اور نامور شخصیت بھی۔ سید شفیع کے بڑے فرزند مصنف سید ہاشمی فرید آبادی۔ سید مطلبی فرید آبادی، سید ابو تمیم فرید آبادی سماجی کارکن اور نامور شاعر و انشا پرداز تھے۔

نمونہ کلام

کیا کہنا ہے نیر ترے قربان بیاں کے
سب زخم ہرے ہو گئے ناسور نہاں کے
تلوار کے فقرے ہیں کہ فقرے ہیں زباں کے
زخمِ دل مجروح کے کٹ کٹ گئے ٹانکے

....

نہ کام آئیں فسوں گفتاریاں و قتِ سخن اس سے
تمہیں چپ کیسی نیر لگ گئی جادو بیاں ہو کر

....

بہت غمگین و حسرت مند دیکھے
مگر نیر کوئی تم سا نہ پایا

....

فارسی قطعہ۔ (تہنیت بنام نواب سر امیر الدین احمد فرخ مرزا)

مبارک باد گویاں ماہ عید روزہ ہا آمد
زگردوں جام شیراز بہر فرخ میرزا آمد
امیر الدین بہادر فخردین و دولت و دانش
رخش مہر ضیاء آمد کفش بہر عطا آمد
قیاس طاعت انجم ازیں حامی تو ال کردن
کہ نیر را دل از میر تو سرگرم ثنا آور

سید ہاشمی فرید آبادی

سید ہاشم علی ۳۰ جنوری ۱۸۹۱ء کو فرید آباد میں پیدا ہوئے۔ اور ہاشمی فرید آبادی کے نام سے شہرت پائی۔ ہاشمی سید شفیع نیر کے بڑے صاجزادے تھے۔ ابتدائی تعلیم فرید آباد میں پائی۔ میٹرک اینگلو عربک اسکول دہلی سے کیا۔ اور پھر علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا علی گڑھ کی تعلیم کے دوران ان کی ملاقات مولانا حسرت موہانی سے ہوئی اور وہ سامراج دشمن بن گئے۔ انہوں نے بہت پر جوش نظمیں لکھیں شاعرانہ ذوق ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ان کی شاعری قومی جوش و جذبات سے پر تھی۔ ہاشمی صاحب نے مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ''ہمدرد'' اور ''کامریڈ'' میں کام کیا۔ اسی دوران بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ملاقات ہوگئی اور وہ ان کے ساتھ کام کرنے لگے انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوکر انہوں نے بے شمار تحریری کام کئے طبعزاد اعلیٰ مضامین، ترجمے، اور تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ ہاشمی صاحب کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ شدہ کتابوں نیز منظومات کی مکمل فہرست پیش کرنا دشوار ہے۔ ان کے مضامین قومی زبان کراچی۔ دائرہ معارف اسلامیہ لاہور۔ اردو نامہ کراچی کے علاوہ برعظیم کے دوسرے بیشمار رسائل میں چھپتے تھے۔ پلوٹارک کی مشہور کتاب Parallel Lives چار جلدی ضخیم ترجمہ ''مشاہیر یونان رُومہ'' ان کی مشہور کتاب ہے جسے انجمن ترقی اردو شائع کرتی رہتی ہے۔ اردو ادب کا شاہکار ہے۔ ہاشمی صاحب کی انگریزی بھی لاجواب تھی ۱۹۴۹ء تک حیدر آباد دکن اور بھارت کے دوسرے تعلیمی اداروں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی تھیں ان میں بیشتر ہاشمی صاحب کی تالیف یا ترجمہ کی ہوئی تھیں۔ تقسیم ہند کے بعد ہاشمی صاحب فرید آباد سے پاکستان (کراچی) آئے۔ اور کراچی و لاہور میں قیام کیا۔ مرتے دم تک ان کا علمی کام جاری رہا۔ ان کا انتقال ۱۹ جنوری ۱۹۶۴ء کو لاہور میں ہوا۔

سید مُطلّبی فرید آبادی

سید مُطلّبی فرید آبادی ۱۸۹۳ء کو فرید آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نواب سید احمد شفیع نیر فرید آباد کے جاگیردار تھے۔ ان کی والدہ ریاست لوہارو کے نواب علاء الدین علائی کی صاحبزادی تھیں۔ سید شفیع نیر کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنے بیٹوں کی تربیت کی اگرچہ سید مُطلّبی نے جاگیردارانہ ماحول میں آنکھ کھولی۔ مگر وہ فطری طور پر انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ نوعمری ہی میں انہوں نے جدوجہد آزادی میں حصہ لیا اور مولانا حسرت موہانی کی روش پر مذہبی انداز کے کمیونسٹ ہو گئے۔ برطانوی دور میں وہ گرفتار بھی ہوئے۔ اور روپوش بھی ہوئے۔ سید مُطلّبی کو شعروادب کا ذوق ورثے میں ملا وہ شاعری کو ایک بامقصد اور موثر ذریعہ خیال سمجھتے تھے روس میں سوشلسٹ انقلاب ہوا تو ہندوستان میں سوشلسٹ پارٹی کے رکن بن گئے۔ ذہنی طور پر ان کو مارکسی نظریات سے بہت لگاؤ تھا۔ اسوقت کمیونسٹ پارٹی ممنوع تھی تو انہوں نے کانگرس میں شرکت کر لی۔ کسان سبھا کے ممبر بنے اور سماجی کام کرنے لگے ''جہانیاں کسان'' کانفرنس کی صدارت کرنے اور انقلابی تقریریں کرنے پر ان کو کئی مرتبہ جیل بھی جانا پڑا۔ اور حکومت ہند نے بار بار سخت قید و بند کی سزادی۔ سید مُطلّبی نے سامراج کے خلاف اور امن تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا۔ تقریباً پچاس سال تک وہ کمیونسٹ تحریک سے وابستہ رہے۔ انہوں نے اپنی پرجوش شاعری سے سماج میں تبدیلی کے عمل کو تیز کیا۔ وہ مزدوروں کے جذبات اور امنگوں کے صحیح ترجمان تھے۔ ان کی شاعری کے موضوعات حقیقی زندگی سے متعلق ہیں۔ ان کی ساری شاعری دکھی اور محنت کش انسانوں کی شاعری ہے برج بھاشا میں ان کی نظمیں برصغیر کے ادب کا گراں مایہ سرمایہ ہیں۔ شاعری میں ان کا منفرد مقام ہے۔ سید مُطلّبی تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے ماڈل ٹاؤن میں

رہائش اختیار کی اور آخر وقت تک محنت کشوں کو بیدار کرنے کی صبر آزما جدوجہد میں مصروف رہے۔ مرتے دم تک ادب کا دامن نہ چھوڑا ۸۵ سال کی عمر میں لاہور میں وفات پائی۔

نمونہ کلام

صاحبو دنیا میں جو ہل چل مچی ہے آج کل
اس کا باعث اصل میں یہ تین ہی کردار ہیں

ہیں ہمارے کھیل کی بنیاد یہ ارباب ذوق
جس میں پنہاں اور ہو یدار سینکڑوں اسرار ہیں

بادشاہت چیز کیا ہے اور کیا ہے سلطنت
مال و زر کی اصل کیا ہے اور کیا زر دار ہیں

محنتی طبقے میں کیوں ہل چل کی پیدائش ہوئی
خاک میں جس کو ملا دینے کو سب تیار ہیں

پھرتے ہیں کیوں برہنہ دنیا کو جو بخشیں لباس
فاقہ کش رہتے ہیں کیوں جو وجہ پیدا وار ہیں

قطعہ

زرہ ہر تابدار حرکت سے
آمدِ نو بہار حرکت سے
چشم بینا کی روشنی کی قسم
زندگی میں نکھار حرکت سے

پاکستان کے سب دکھیارے دل بادل بن جائیں گے
مزدور اور کسان کے نعرے ہفت افلاک سے ٹکرائیں گے
جاگیر و سرمائے کے گنبد، یہ خونِ غریباں کے مرقد
کھنڈرات بنیں گے سب یکسر مظلوم انہیں ٹھکرائیں گے

....

آفات و مصیبت سے مت ڈر
اور ظلم و ستم کا خوف نہ کر
آفاق میں ہل چل دیکھ ذرا
ہے نوع بشر سب محو سفر
اُٹھ باندھ کمر مایوس نہ ہو
مایوس نہ ہو اٹھ باندھ کمر

(مزدور اور کسان کا گیت)

ملک کے مالک اب ہم ہیں ملک کے خادم اب ہم ہیں
کون وہ محنت کرنے والے کپڑا تا بننے والے
غلہ پیدا کرنے والے دن بھر شب بھر مرنے والے
ساری ملیں چلانے والے سڑکیں محل بنانے والے
تھوڑا تھوڑا کھانے والے اور بھوکوں مر جانے والے
ملک کے مالک اب ہم ہیں ملک کے خادم اب ہم ہیں
ہیا ہیا بھیا سیدِ مُطّلبی کا نعرہ
جس سے ڈر کر گورا ہارا ہیا ہیا بھیاہیا ہیا

....

سید ابو تمیم فرید آبادی

مشہور مزاح نگار سید ابو تمیم فرید آبادی سید احمد شفیع نیر کے چھوٹے بیٹے۔ نوابزادی رضیہ بانو بنت نواب علاء الدین علائی والی ریاست لوہارو کے صاحبزادے تھے ۱۹۰۵ء میں فرید آباد میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی اور دہلی میں مکتبہ انجمن ترقی اردو کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ اور کتابوں کی تجارت میں مصروف ہو گئے۔ سید ابو تمیم کو ادبی ورثہ اپنے ماحول سے ملا تھا ادب سے ایسا دلی لگاؤ ہوا کہ انہوں نے ساری زندگی تصنیف و تالیف کے سوا کوئی کام نہ کیا۔ خود بہت اچھے مزاح نگار تھے۔ "رنگین لفافہ" "گدھوں میں بیداری" ان کے مقبول مزاحیہ ناول ہیں۔ ابو تمیم نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بہت سے خطوط جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کئے تھے۔ ابو تمیم نے بچوں کے لئے بھی بہت کام کیا۔ "میٹھی" کہانیوں کے نام سے بچوں کی بڑی دلچسپ کہانیاں لکھیں۔ "لال پری" "نیلم پری" "سبز پری" "کالا دیو" اور "گرم حلوہ" ان کی مشہور کہانیاں ہیں ابو تمیم نے پانچ کھلنڈروں کے نام سے ایک کتابی سلسلہ بھی تحریر کیا۔

۱۔ پہلے کھلنڈرے انو بونگے

۲۔ دوسرے کھلنڈرے ولی سیانے

۳۔ تیسرے کھلنڈرے آغا مسموسے

۴۔ چوتھے کھلنڈرے رسید بھیے

۵۔ پانچویں کھلنڈرے جمیل چلبلے۔ ان کے ساتھ برجیس مٹکے

ابو تمیم نے انگریزی سے اردو میں کئی ترجمے کئے مشرقی پاکستان (چٹا کانگ) میں وہ ایک اشاعتی ادارہ فرید سنز کے لئے بھی کام کرتے رہے۔ ہندوستان کے مختلف ادبی رسائل میں بھی باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ ان میں "تہذیب الاخلاق" "عصمت" "شمع" قابل ذکر ہیں سید ابو تمیم کو مزاحیہ ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کا انتقال ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو لاہور میں ہوا۔

نواب علاء الدین احمد خان علائی

نواب علاء الدین احمد خان علائی۔نواب امین الدین احمد خان کے بڑے فرزند تھے۔ علائی ۲۵ دسمبر ۱۸۳۲ء کو پیدا ہوئے۔اپنے والد کی زندگی ہی میں مسند نشین ہوئے۔کیونکہ ان کے والد نواب امین الدین احمد خان بیمار رہنے لگے تھے۔اور ریاست کے انتظام سے رضا کارانہ دست بردار۔نواب علاء الدین کی تعلیم مرزا غالب کی نگرانی میں ہوئی۔نواب علائی کو علمی و ادبی ماحول ورثے میں ملا تھا۔ان کے تخلص مرزا غالب کے تجویز کردہ تھے۔فارسی میں نسیمی اور اردو میں علائی۔ان کا زیادہ کلام فارسی میں ہے۔مرزا غالب علائی سے بہت محبت کرتے تھے۔غالب علائی کو"اے مری جان" اور کبھی "یہ مرزبان لوہارو" کہا کرتے تھے۔مرزا غالب ہی کی نگرانی کا نتیجہ تھا کہ نواب علائی بڑے عالم فاضل بنے۔مرزا غالب نے انہیں تحریری سند دی۔اردو فارسی نظم ونثر میں اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کیا۔نواب علائی نے ریاست لوہارو میں ایک چھاپے خانہ "فخر المطابع" کے نام سے قائم کیا۔جہاں سے علمی و ادبی کتابیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ایک پندرہ روزہ اخبار "امیر الاخبار" کے نام سے (امیر الدین ان کے بیٹے کا نام تھا) نکالا ان کی قلمی بیاض جو لوہارو کے کتب خانہ میں تھی۔اب رضا لائبریری رامپور میں ہے۔غالب نے نواب علائی کو تقریباً ۵۶ چھپن خطوط لکھے۔فارسی خطوط مستزاد۔نواب علائی نہایت مہذب، باوقار اور پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔نہایت اعلیٰ کردار سخنور اور سخن فہم تھے۔نواب علائی کی وفات جمعہ کے دن ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء میں ہوئی۔قطب صاحب دہلی میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہیں۔

(نواب علائی کے وہ اشعار جو ''تلامذہ غالب'' از مالک رام سے لیے گئے۔)

الطاف حق کو وقتِ مصیبت تو یاد رکھ
ہر گز نہ ہو بلاو عنا میں تو ناصبور
روتا ہے وقتِ رنج و بلا بھول کیوں گیا
آرام و عافیت وہ تمام عیش اور سرور
بس شرم کر کہ تھوڑی سی زحمت میں ہائے ہائے
کر یاد لطف سابقہ اے بندہ کفور

رکھیو سنبھل کے پاؤں جو بینا ہو چشم و دل
کچھ سمجھ کے کام جو روشن دماغ ہے
وہ گل جو آج ہے قدحِ موجِ خیز رنگ
وہ لالہ جو کہ باغ کا چشم و چراغ ہے
جس جا کہ تھا ترانۂ بلبل نشاط خیز
اس جا پہ آج دل شکن آواز زاغ ہے
مغرور جاہ سے یہ کہو تم علائیا
کل ایک سطح خاک ہے جو آج باغ ہے

اللہ رے بے ثباتیِ عمر فنا پسند
بجھتا ہے یہ چراغ پلک کی ہوا کے ساتھ
شکوہ ہے کیوں قبول میں، گر ہو مضائقہ
آخر کسی کا نام تو لوں میں دعا کے ساتھ
درماں پذیر درد اگر ہے، تو خاک ہے
دیں جاں کیوں نہ درد کے بدلے، دوا کے ساتھ

ہز ہائی نس

نواب سر امیر الدین احمد خان فرخ مرزا فرخؔی

نواب سر امیر الدین احمد خان فرخ مرزا فرخی ۱۸۶۰ء کو پیدا ہوئے یہ نواب علاء الدین احمد خان والی لوہارو کے فرزند تھے۔ ابتدائی تعلیم اتالیقوں سے لوہارو میں حاصل کی۔ بڑے ہو کر انگریزی ایک انگریز خاتون سے سیکھی۔ اردو، فارسی اور عربی میں دسترس حاصل تھی۔ چونکہ اپنے والد نواب علاء الدین علائی کی زیر تربیت رہے۔ اور مرزا غالب کی آنکھیں بھی دیکھیں۔ ادبی اور علمی ماحول میں پرورش پائی، شعری ذوق پیدا ہوا۔ فرخی تخلص کرتے۔ اس زمانے کی رواج کے مطابق ان کا زیادہ کلام فارسی میں ہے۔ فارسی پر عبور حاصل تھا اپنا روز نامچہ (ڈائری) بھی فارسی ہی میں لکھتے تھے تقریباً ۶۰ ساٹھ عدد ڈائریاں رضا لائبریری رامپور میں لوہارو سیکشن میں محفوظ ہیں۔ نواب فرخ مرزا نے نہ صرف مرزا غالب سے ملاقات کی بلکہ ان کو ایک خط بھی لکھا۔ اس میں ان کو دادا کے لقب سے خطاب کیا۔ جواباً مرزا غالب نے وہ مشہور خط لکھا کہ تمہارے دادا تو نواب امین الدین احمد خان ہیں میں تو تمہارا دلدادہ ہوں۔ نواب فرخ مرزا کے حالات یوں تو کئی کتابوں میں ملتے ہیں۔ مگر سب سے جامع بیان معروف سینئر صحافی جناب عبداللہ ملک (ایڈوکیٹ) کی کتاب ''محمود علی قصوری'' پر تصنیف میں ہے محمود علی قصوری (مرحوم) کی بیگم روشنک بانو، نواب فرخ مرزا فرخی کی ایک پوتی ہیں۔ اس حوالے سے ملک صاحب نے خاندانِ لوہارو پر خاصی گفتگو کی ہے۔ جمیل الدین عالی ایک مختصر دورے پر (انڈیا) رامپور گئے اور اپنے والد نواب فرخ مرزا فرخی کے نظم و نثر کلام کی نقل بعنوان بیاض فرخی۔ نقل کروا رہے ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی اسے شائع کرایا جائے گا زیادہ کلام فارسی میں ہے۔

نمونہ کلام

سلام

در عزاء خانہ لوہارو نذر کردہ شد۔ ماہ محرم ۱۹۳۳ء

فخر غلامی ہے مجھے خیر الورا کے ساتھ
بیعت ازل سے ہے مجھے آلِ عبا کے ساتھ

ہے ہجری یہ ماہ محرم، غم حسین
تازہ کرو نیاز و بکا و عزا کے ساتھ

یہ سرد آہیں سینہ کی غم میں حسین کے
ٹکراتی پھرتی ہیں دم باد صبا کے ساتھ

عشرہ کو کربلا میں رہے جسم بے کفن
پھولوں کی لپٹیں آتی تھیں جن سے ہوا کے ساتھ

گر مہر پنجتن ہے تو پھر بیڑا پار ہے
ہم کو سفر نصیب ہو اس کی ضیا کے ساتھ

مجبور تھے امام حمیت سے دین کی
بیعت نہ کی جو حاکم کفر آشنا کے ساتھ

لڑ کر یہ غازی خلد کے رستہ پہ چل دئے
داخل ہوئے جنان میں بخت رسا کے ساتھ

یاد آگئی جو امتِ جد ہو کے سجدہ ریز
کٹوایا سر حسین نے حق کی رضا کے ساتھ

شام و سحر ہے فرخی میری زبان پر
ہو حشر میرا شافع روز جزا کے ساتھ

رباعی

دنیا میں ہیں ذی منزلت و قدر علی
اور دین کی مسند پہ ہیں اک صدر علی
حقا کہ بیانِ واقعی ہے فرخ
خورشید محمد ہیں تو ہیں بدر علی

غزل

نقش سوزاں ہو یارب کس قدر اس سوختہ جاں کا
کہ ہو ہر داغ دل جس کا مقابل مہر تاباں کا
خرابے گھر کے اور وحشت درو دیوار کی اپنی
بتاتے ہیں کہ ہے نقشہ یہی دشت و بیاں باں کا
عجب کیا فرخی نے یہ غزل لکھی اگر ایسی
کہ ہے زلہ ربائے فیض آخر کس سخنداں کا

قطعہ۔ جنوری ۱۸۸۱ بعمر اکیس سال

بخدمت پدر مکرم نواب علاء الدین علائی

ہوئی حاصل جو تائید خدا سے
بداندیشوں پہ تازہ فتح و نصرت
نتیجہ ہے دعائے باطنی کا
میرے آقا کے کام آئی عبادت
دعائے حاکم و عادل ہے مقبول
کہ شامل اس کے ہے لطف وعنایت
نظیر اسکا نہیں ہندوستاں میں
ہے فضل وعلم کی اس کے یہ شہرت
ہے روحِ حاتمِ طے غرق تشویش
سنی از بس کرم کے اسکی شہرت

....

نوشتہ جنوری ۱۸۷۷

لوہارو سے بوجہ شوق ذاتی — علوم مختلف کی ، کی اشاعت
شروع سال ستر عیسوی میں — ہوئے جو مسند آرائے ریاست
اسی دن سے لوہارو کی زمیں نے — قدومِ فیض سے حاصل کی نزہت
زمیں چشمک زنِ چرخِ بریں ہے — وہ رفعت اور ہے یہ اور رفعت
نہیں مدحت طرازی اسکی ممکن — کہاں فرخ تجھے ایسی لیاقت
ہے ختم مدعا بس اب دعا پر — مرا آقا رہے باعز و دولت
رہے باعزت وباشان وباجاہ — خدایا وہ سلامت تا قیامت

....

غزل

دشمن کی افتراء کا وہاں اب گماں نہیں
خود ہے ستم دلیل کہ نا مہرباں نہیں

کس کام کا ہے درد کہ درماں پذیر ہے
کیا خاک ہے وہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں

دولت ہے گر ملے نفسِ چند کے عوض
خواب دراز مرگ سے لینا گراں نہیں

ہے تنگ سینہ آہ گر آتش فشاں نہ ہو
ہے عار پہرہ چشم اگر خوں چکاں نہیں

رشتہ قوی ہے سبحہ و زنار میں ضرور
لیکن یہ راز شیخ پر ابتک عیاں نہیں

مسجد میں اور میکدہ میں اور دیر میں
فرخ وہ ہرجگہ ہے بتا تو کہاں نہیں

نوابزادہ مرزا ضمیر الدین عالی

نواب زادہ مرزا ضمیر الدین احمد خان عالی۔ نواب علاء الدین علائی والی ریاست لوہارو کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ ابتداء میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم لوہارو میں اتالیق سے حاصل کی۔ اپنے والد کی علمی وادبی صحبت سے متاثر ہو کر نوعمری ہی سے شاعری میں دلچسپی لی اور شعر کہنے لگے۔ عربی اور فارسی میں شعر کہتے مگر جوان ہوتے ہوتے اہل حدیث مسلک اختیار کیا اور شاعری کو خلافِ مسلک قرار دے دیا۔ اپنے گھر پر عربی، فارسی صرف نحو کا درس دینے لگے تھے۔ گلی قاسم جان کی نزدیکی مسجد میں نماز بھی پڑھایا کرتے تھے۔ ضمیر مرزا کا تخلص عالی تھا۔ یہ تخلص غالب نے ان پانچ میں شامل کیا تھا جو انہوں نے اپنے شاگرد نواب علاء الدین احمد والی لوہارو کے لئے تجویز کئے تھے۔ ضمیر مرزا کی شادی دہلی کے ایک معزز خاندان میں ہوئی۔ کوئی اولاد نہ ہوئی تو اپنی سالی کی صاحبزادی ''عائشہ بیگم'' کو منہ بولی بیٹی بنا کر پالا۔ پھر وہ دہلی کے مشہور خاندانی حکیم ناصر الدین چنوں میاں سے بیاہی گئیں ۱۹۴۳ء میں ضمیر مرزا کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد سب مال واسباب اور کتب خانہ صاحبزادی عائشہ بیگم کی تحویل میں آیا۔ عائشہ بیگم بھی بھارت (انڈیا) دہلی میں خدا کو پیاری ہوئیں۔ افسوس ان کے انتقال کے سبب ضمیر مرزا صاحب کا کوئی فارسی، عربی کلام حاصل نہ کیا جاسکا۔

نوابزادہ مرزا اعتزاز الدین احمد ہمایوں

(آزادی کے بعد پاکستان کے پہلے انسپکٹر جنرل اسپیشل پولیس) نواب زادہ اعتزاز الدین احمد خان ہمایوں۔ نواب سرامیر الدین احمد خان فرخ مرزا فرّخی کے صاحبزادے تھے۔ ان کی کی والدہ کا نام اختری بیگم تھا جو نواب سراج الدین سائل کی سگی بہن تھیں۔ غالباً ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے چھوٹے چچا نواب ضمیر الدین عالی سے فارسی اردو اور عربی میں حاصل کی۔ پھر ایچی سن کالج لاہور میں تعلیم پائی پیار کا نام ہمایوں میاں تھا۔ بہت خوش شکل اور وضعدار انسان تھے خدا ترس، مہمان نواز کے ساتھ ادب نواز بھی تھے ادبی ذوق ورثے میں ملا شعر کم مگر خوب کہتے تھے۔ زیادہ تر تقریباتی شاعری کرتے مگر شعراء کی سرپرستی میں خوب مصروف رہتے۔ کئی ضلعوں میں اہل ادب کی عملی سرپرستی کرتے رہے۔ جالندھر میں مدرستہ البنات کی سرپرستی اور ترقیات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور مسلمان امراء سے خطیر امداد بھی دلوائی۔ ابتداء میں نامزکمیشنڈ افسر ہو کر فوجی خدمت کی پھر امپیریل (انڈین) پولیس میں بطور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس لے لئے گئے۔ زیادہ تر تعیناتی پنجاب کے ضلعوں میں رہی۔ اپنی خاندانی شرافت اور ایمانداری سے بڑی نیک نامی کمائی۔ حکومتِ ہند میں اینٹی کرپشن محکمہ قائم ہوا تو یہ ڈی۔ آئی۔ جی ہو گئے اور پاکستان بنتے ہی اسپیشل پولیس کے انسپکٹر جنرل بنا دئے گئے۔ اگست ۱۹۵۲ء میں شہد ملت لیاقت علی خان۔ وزیر اعظم پاکستان کی شہادت کی تفتیش انہیں کے سپرد ہوئی۔ اس سلسلہ میں لاہور سے بذریعہ ایرفورس ہوائی جہاز پشاور جا رہے تھے کہ جہاز کھیوڑہ (ضلع جہلم) پر سے اڑتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گیا۔ مبینہ طور پر ان کے پاس جو کاغذات اس کی تفتیش کے تھے وہ بازیاب نہ ہو سکے۔ جبکہ جہاز جلا بھی نہ تھا۔ یہ حادثہ آج تک سربستہ راز ہے۔ ہمایوں میاں اور پائیلٹ

گروپ کیپٹن احمد کی لاشیں جلی ہوئی نہ تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ جہاز کا ایندھن فضا میں ہی جل گیا تھا۔ (جس کے اسباب میں کوئی سازش بھی ہوسکتی ہے) واللہ اعلم بالصواب ہمایوں میاں کی شادی ان کی اپنی پسند سے خاندان سے باہر ہوئی۔ ان کے یہاں تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔

صاحبزادے۔

میجر اسد الدین احمد۔ صاحبزادہ کرنل اعتصاد الدین کا مگار۔ صاحبزادہ عزد الدین احمد ہندال (غلط العوام میں عزت الدین)۔

صاحبزادیاں۔

صاحبزادی نور جہاں بانو بیگم۔ صاحبزادی سارا سکینہ بانو بیگم۔

نمونہ کلام

غزل

بن محبت خوشی نہیں ملتی — اے ہمایوں کبھی نہیں ملتی

خاندانی وجاہت اپنی جگہ — ورثے میں شاعری نہیں ملتی

نسبت غالبی یہ فخر سہی — شوکتِ غالبی نہیں ملتی

مشق معروف تا بہ فن علائی — مفت میں فرخی نہیں ملتی

بھائی اعظم کی محنتیں جو ہوں — شہرت اعظمی نہیں ملتی

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ — کوئی نعمت یونہی نہیں ملتی

زندگی بھر بغیر عشق خدا — عشق کی زندگی نہیں ملتی

کیا عجب قصہ ہے ہمایوں کا — زندگی کھوگئی نہیں ملتی

نوابزادہ مرزا اعتزاز الدین احمد خان ہمایوں

ڈاکٹر نوابزادہ جمیل الدین عالؔی

نوابزادہ مرزا جمیل الدین عالؔی۔ ہز ہائی نس نواب سر امیر الدین احمد خان فرخ مرزا اف لوہارو کے ساتویں صاحبزادے ہیں۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا نام سیدہ جمیلہ بیگم تھا۔ جو نواب سر امیر الدین کی چوتھی بیوی اور سید خواجہ میر درد دہلوی کی پڑپوتی تھیں۔ ان کے والد سید ناصر وحید تھے جو خواجہ میر درد کے سجادہ نشین خواجہ ناصر وزیر کے چھوٹے بیٹے تھے۔ بارہ سال کی عمر میں عالی اپنے والد کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ سیدہ جمیلہ بیگم نے ان کی پرورش نہایت ناز و نعمت سے کی پانچویں جماعت تک گھر پر اتالیق سے پڑھا۔ میٹرک اینگلو عربک اسکول دریا گنج دہلی اور بی۔ اے۔ اینگلو عربک کالج سے کیا۔ تقسیم کے بعد پاکستان آئے۔ جامعہ کراچی سے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ کی ڈگری لی۔ اور پھر ۱۹۵۱ء میں سی۔ ایس۔ ایس۔ کے امتحان میں کامیاب ہو کر سروس میں آ گئے۔ عالی کی شادی اپنی ددھیال میں اپنے چچازاد بھائی مرزا صمصام الدین فیروز کی صاحبزادی طیبہ بانو سے ہوئی۔ عالؔی نے اپنا بچپن اپنے سگے چچا نوابزادہ ضمیر الدین عالؔی۔ جو اہل حدیث اور عربی۔ فارسی کے عالم تھے۔ اور رشتے کے چچا نواب سراج الدین سائل دہلوی کی صحبت میں گذارا۔ جمیل الدین عالی کو ان کے چچا نوابزادہ ضمیر مرزا نے اپنا تخلص عالؔی عطا کیا تھا۔ یہ تخلص ان پانچ میں سے ایک تھا جو غالؔب نے اپنے چہیتے شاگرد نواب علاء الدین علائی کو ان کیلئے تجویز کیے تھے۔ نواب علاء الدین نے فارسی میں نسیمی اور اردو میں علائی پسند کیے۔ جمیل الدین عالی بچپن ہی سے بہت ذہین طباع اور حساس تھے۔ اپنے چچاؤں کی عالمانہ صحبت اور دہلی کی علمی و ادبی فضا نے عالی کے ذہن کو جلا بخشی۔ وہ نوعمری ہی سے شعر کہنے لگے۔ اور اپنے تخلیقی شعور کے اظہار پر توجہ دینے لگے۔ عالی نہ صرف مرزا غالب سے متاثر ہیں

بلکہ اپنے چچاؤں اور اپنے پھوپھی زاد بھائیوں سید ہاشمی فرید آبادی اور سید مُطلّبی فرید آبادی سے بھی۔ عالی کے فطری والہانہ پن نے اپنا اثر دکھایا۔ اور وہ جلد ہی مشہور شعراء میں شامل ہو گئے۔ ابتداء میں انہیں غزلوں میں انفرادیت کیوجہ سے خاصی ملک گیر شہرت حاصل ہوئی مگر انہیں ''دوہوں'' سے جو شہرت حاصل ہوئی اس کا کوئی مقابلہ نہیں ''دوہوں'' میں وہ رجحان ساز بھی تسلیم کئے گئے۔ انہوں نے اپنے کھلے اظہار کے لئے دلّی کی بھاشا اختیار کی اور اردو کے ذریعے دوہے کی شاعری عام لوگوں تک بھی پہنچی۔ عالی نہایت خوش گلو بھی ہیں۔ ''دوہے'' بڑے دل کش انداز میں پڑھتے ہیں۔ سچ ہے عالی کے ترنم نے دوہوں کی دل کشی میں اضافہ کیا اور دوہوں کی مقبولیت نے عالی کو شہرت بخشی۔ جدید عہد میں دوہے کہنے کی جو روایت پھیلی وہ عالی کی مرہون منت ہے۔ عالی صرف ایک مقبول شاعر ہی نہیں ایک منفرد نثر نگار بھی ہیں۔ عالی نے نثر نگاری کا آغاز ''خاکہ نویسی'' اور سفر نامہ نگاری سے شروع کیا۔ انجمن ترقی اردو میں بابائے اردو کے ساتھ مسلسل علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہے اور بے شمار مقدمے لکھے۔ ان کی تحریروں میں علم و ادب سے دلچسپی کے علاوہ اپنے ملک کے مسائل سے گہرے لگاؤ کا احساس ملتا ہے۔ انجمن کی علمی و ادبی تحقیقی کتابوں مخطوطات اور لغات وغیرہ پر ان کے مقدمے ''حرفِ چند'' کے عنوان سے چھپتے رہتے ہیں ان میں سے ایک سو پچاس ''حرفِ چند'' تین جلدوں پر مشتمل اسی عنوان کی کتابوں میں شامل ہو چکے ہیں۔ عالی نے ''سفرنامے'' بھی لکھے۔ یوں تو سفرناموں کی روایت کافی پرانی ہے مگر پاکستانی سفرناموں میں عالی کے سفرنامے اوّلین سفرناموں میں شامل اور ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے ''سفرنامے'' اخبار جنگ میں ''دنیا میرے آگے'' اور ''تماشا میرے آگے'' کے نام سے بہت مقبول ہوئے۔ عالی اپنے سفرناموں میں مشاہدات و تجربات اور واقعات بیان کرتے ہیں وہ سب سچائیاں اور زندگی کے بنیادی حقائق ہیں وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں۔ سچائی سے بیان کر جاتے ہیں یہی اسلوب ان کے سفرناموں کی خاص خوبی ہے۔ عالی نے نہ صرف اپنی ذاتی زندگی کے فرائض بحسن و خوبی نبھائے بلکہ اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ قومی یک جہتی رائیٹرز گلڈ۔ انجمن ترقی

اردو۔ ادیبوں کی فلاح و بہبود۔ اردو کالجوں جیسے اداروں میں اعزازی معتمدی خاص طور سے اردو سائنس کالج کی نئی عمارت کی تعمیر وغیرہ ان کی انتھک محنت کا ایک قابل تحسین کارنامہ ہے۔ قومی سطح پر بے شمار علمی و ادبی شخصیات نے عالی کے ثقافتی کارناموں کا اعتراف کیا ہے۔ بھارت (انڈیا) میں بھی ان کے فن اور شخصیت پر ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔

جامعہ کراچی نے ان کو ڈی۔ لٹ۔ کی اعزازی ڈگری سے نوازا ہے صدر پاکستان نے ۱۹۹۱ء میں انہیں صدارتی اعزاز دیا۔ پھر حکومت نے ۱۹۹۸ء میں ''ہلال امتیاز'' سے نوازا۔ کوآپراپاکستان ائرزکواپریٹوسوسائٹی لاہور۔ کراچی نے ''ارمغان عالی'' مرتب اور شائع کی۔ ماہنامہ ''دنیائے ادب'' کراچی نے گیارہ سو اٹھائیس صفحے پر مشتمل ''جمیل الدین عالی نمبر'' مرتب اور شائع کیا۔ عالی کی کالم نگاری اردو نثر میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے عالی اپنے عہد کی آواز کہلاتے ہیں۔

جمیل الدین عالی ایک معروف شاعر۔ کالم نگار۔ سفر نگار اور قومی نغمہ نگار کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے ملّی نغموں۔ ''وطن کے سجیلے جوانو'' اور ''جیوے جیوے پاکستان'' کی آواز نہ صرف پاکستان بلکہ باہر کے ممالک میں بھی سنائی دیتی ہے عالی نے ایک طویل نظمیہ ''انسان'' شروع کر رکھا ہے۔ جو ہزاروں مصرعوں پر مشتمل ہے۔ بعض نقادوں نے اسے نامکمل ہونے کے باوجود ایک نادر اور منفرد مقام عطا کیا ہے۔

عالی کی تخلیقات نثر

''دنیا میرے آگے،، ''تماشا میرے آگے،، ''صدا کر چلے،،

''دعا کر چلے،، ''وفا کر چلے،، ''حرفِ چند،، ''چین جیسا میں نے دیکھا،،

مترجم ''ایشین ڈرامہ'' ''شنگھائی کی عورتیں'' شریک مؤلف اصطلاحاتِ بنکاری۔ شریک مؤلفِ لغت۔ ''منتخب جدید اقتصادی اصلاحات تشریح و تاریخ''
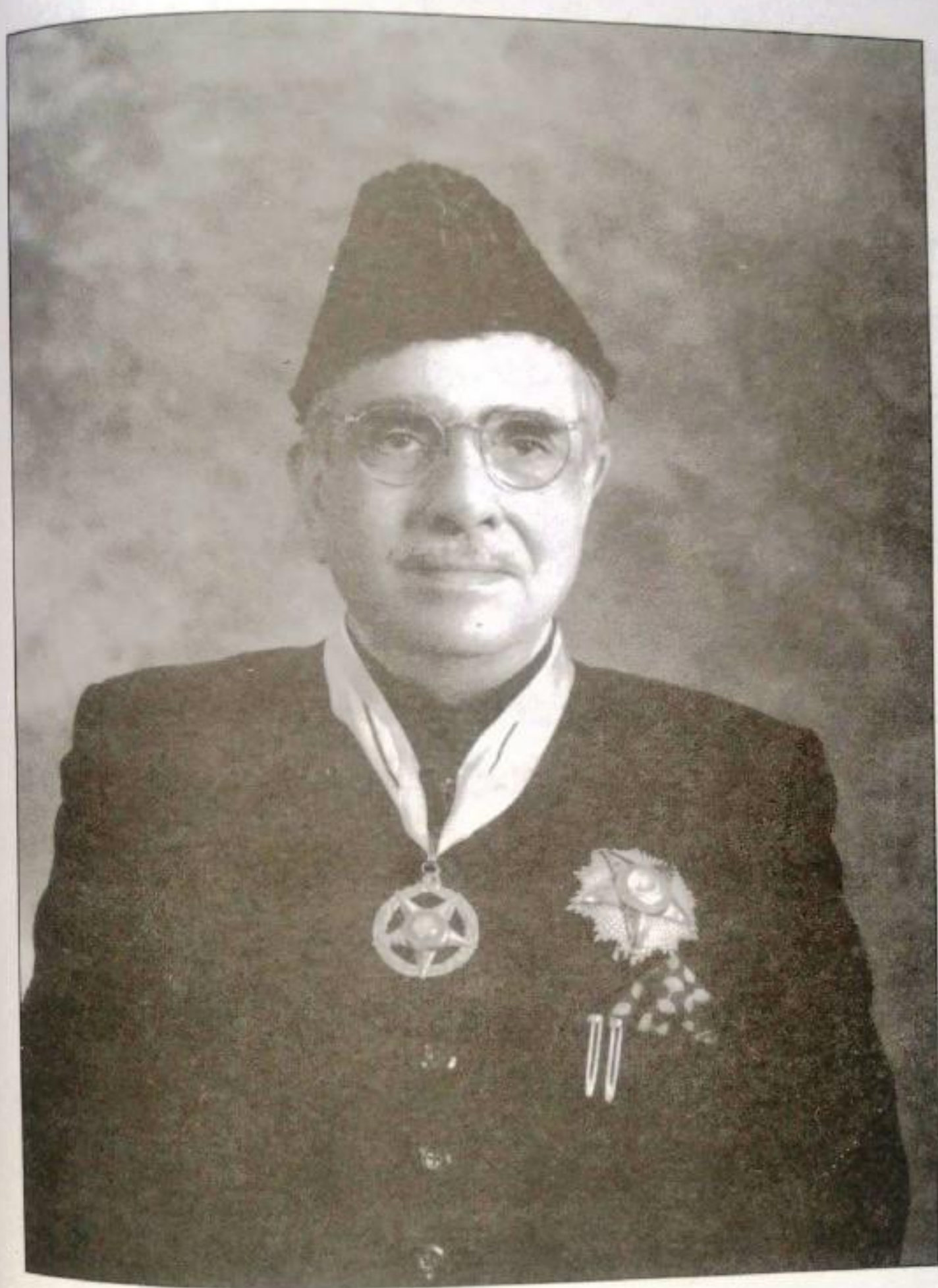
ڈاکٹر نوابزادہ مرزا جمیل الدین عالی

شاعری

مجموعہ کلام غزلیں دوہے گیت "لاحاصل"۔ "اے مرے دشت سخن" "جیوے جیوے پاکستان۔ "انسان" (زیر ترتیب)

اعزازات

ستِ کبیر ایوارڈ (اردو عالمی کانفرنس دہلی)

نشانِ سپاس (کینیڈین اردو اکیڈمی، ٹورانٹو)

صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی ۱۹۹۱ء

ہلال امتیاز (حکومت پاکستان ۱۹۹۸ء

نشانِ سپاس۔ (آرٹ کونسل آف پاکستان)

نشانِ سپاس (کراچی روٹری کلبوں کی طرف سے)

پاکستان سمیت دنیا کے ان شہروں میں عالی کی خدمات کے اعتراف میں خصوصی جشن کا اہتمام کیا گیا۔

ابوظہبی، دبئی، جدہ، نیوجرسی، لاس اینجلس، ہیوسٹن، مایامی، ٹورانٹو، مانٹریال، نیویارک عالی کو ۲۰۰۱ء کا۔ اے۔ آر۔ وائی گولڈ۔ لٹریری ایوارڈ (دس ہزار امریکی ڈالر کے ساتھ) ملا ہے۔

عالی خود پاکستان رائٹرز گلڈ کے پلیٹ فارم سے قومی ادبی انعامات کے بانی ہیں۔ جو نجی شعبے سے قائم کرائے۔ آدم جی ادبی انعام داؤد ادبی انعام۔ نیشنل بینک۔ حبیب بینک اور یونائیٹڈ بینک ادبی انعامات۔ ان کئی اوقاف (TRUSTS) کے بانی رکن ہیں جو مرحوم ادیبوں کے خاندانوں کیلئے قائم کئے گئے۔ ۱۹۶۲ء سے انجمن ترقی اردو پاکستان کے تاحال معتمد اعزازی اور لغت بورڈ کے صدر ۱۹۹۸ء تا ۲۰۰۱ء تک۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے سکریٹری ۱۹۶۷ء۔ ۱۹۵۹ء اور سکریٹری جنرل ۷۰۔ ۱۹۶۷ء انہوں نے مشرق ومغرب میں دنیا کے بہت سے

ممالک کا سفر کیا۔ کبھی بہ حیثیت مندوب۔ کبھی فرائض منصبی کے سلسلے میں۔ ایک بار یونیسکو کے شش ماہی وظیفے پر۔ اور ایک مرتبہ ہارورڈ انٹرنیشنل سیمینار میں بطور منتخب نمائندہ از پاکستان۔

نمونۂ کلام

دوہے

عمر گنوا کر پیت میں ہم کو اتنی ہوئی پہچان
چڑھی ندی اور اتر گئی پر گھر ہو گئے ویران

ساجن ہم سے ملے بھی لیکن ایسے ملے کہ ہائے
جیسے سوکھے کھیت سے بادل بن برسے اڑ جائے

دوہے کبت کہہ کہہ کر عالی من کی آگ بجھائے
من کی آگ بجھے نہ کسی سے اسے یہ کون بتائے

غزل

کہیں تو ہوگی ملاقات اے چمن آرا
کہ میں بھی ہوں تری خوشبو کی طرح آوارہ

جہانِ خلوص و روحِ تمنا کہیں جسے
ہم اس کو ڈھونڈتے ہیں کہ اپنا کہیں جسے

ذہن تمام بے بسی روح تمام تشنگی
سوچ یہ ہے اپنی زندگی جس کے تھے اتنے اہتمام

ہنسی میں تلخیِ ایام کو چھپائے ہوئے
چلے چلو یونہی بارِ حیات اٹھائے ہوئے۔

ہز ہائی نس نواب اِعزالدین احمد خان اعظم مرزا

نواب اِعز الدین اعظم مرزا۔نواب سرامیرالدین احمد خان فرخ مرزا کے صاحبزادے تھے۔۲۷دسمبر ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔اورنواب امیرالدین احمد خان کی زندگی ہی میں عنان ریاست سنبھالی۔(وہ اعظم مرزا کو حکمران دیکھنا چاہتے تھے) نواب اعظم کو بچپن ہی سے شاعرانہ فضاملی۔تو شعر کہنے لگے۔بہت حسّاس اور ذہین طبع شاعر تھے۔دو سال میں ہی اپنا دیوان۔''دیوانِ اعظم''مکمل کرلیا۔انہوں نے اپنے کلام میں غزل کے علاوہ مثنویاں زیادہ لکھیں۔مثنوی نور جہاں جہانگیر۔مثنوی گلزارِاعظم۔ان کا ادبی کارنامہ ہے۔مثنوی کا شوق ان کو اپنے ماموں نواب سائل کی صحبت میں ہوا۔جوخود نور جہاں اور جہانگیر کی کہانی نظم کر رہے تھے۔اعظم مرزا کا کلام بھی خوب ہے وہ 42 بیالیس سال کی عمر میں اپنے والد کے سامنے ہی ۱۹۲۶ء میں خدا کو پیارے ہوئے۔

نمونہ کلام

کیا ہو سکے اللہ بیاں تیرے کرم کا
جھکتا ہے ترے سجدے میں سر میرے قلم کا

جلے گا کوئی دن میں سارا زمانہ
میرے سوز کا تم اثر دیکھ لینا

بری اعظم خستہ تن کی تھی حالت
ملے گی نہ اچھی خبر دیکھ لینا

اک دل ہے اور رنج زمانہ ہے بے شمار
صدمے ہزار رنج کے کیونکر اٹھائے دل

یہ مانا ہم نے اعظم ہے بڑی دلدار کی فرقت
نہ آئیں گر تو کیا ہے جب ہمارے دل میں رہتے ہیں

گئے سب چھوٹ اعظم اور ساتھی
مگر اک سوز ہجراں نے وفا کی

قطعہ

(اپنے والد محترم نواب امیر الدین فرخ مرزا کی شان میں)

جہاں میں فرخ ذی جاہ سا امیر نہیں
کہ جس کے جود و سخا کی کوئی نظیر نہیں
وہ کون شخص ہے سارے جہان میں اعظم
جو سر امیر کے الطاف کا اسیر نہیں

قطعہ

(اپنے بھائی نواب ابراہیم علی خان والی پٹودی کی مسند نشینی پر)

گلستان پٹودی میں الٰہی
یونہی رکھیو بہار دائمی کو
ترا احسان ہے یارب کہ تو نے
دکھایا آنکھ سے ایسی خوشی کو
ادا ہو کس طرح حق تو وہ شکر
کیا نواب ابراہیم علی کو

ہز ہائی نس

نواب امین الدین احمد خان ثانی شہر یار مرزا

نواب امین الدین احمد خان ثانی۔نواب اعز الدین احمد خان اعظم مرزا والی ریاست لوہارو کے صاحبزادے تھے۔اور ریاست لوہارو کے آخری نواب ۱۹۴۷ء تک۔نواب امین الدین ثانی شہر یار مرزا نے ادبی ماحول میں آنکھ کھولی۔شاعری کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔نوعمری میں ہی لکھنے کی ابتدا کی۔ثانی نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ نثر نگار ادیب بھی تھے۔انہوں نے نوعمری ہی میں ایک معاشرتی ناول ''فانوس خیال'' لکھا۔افسانے اور شیر کے شکار پر مضمون بھی لکھے۔ان کا خاص ادبی شاہکار ''انبساط وانتشار'' ہے۔جس میں انہوں نے اعلیٰ زبان وبیان کا ثبوت دیا ہے۔اپنے والد کے دور حکومت کا نقشہ بھی بہت خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ان کے ذوق سخن کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

نمونہ کلام

عجب عہد اعظم کا ہے ماجرا — عجب دور تھا خوشنما خواب سا
ولی عہدی سے ہی کئے ایسے کام — کہ روشن ہوا جس سے دنیا میں نام
سیاست سے حکمت سے تدبیر سے — نگہداریٔ حسن تقدیر سے
چمن میں کسی کو شکایت نہ تھی — سبھی مطمئن گل بھی اور خار بھی
قرینے کا ہر کام ہر شے درست — ملازم ادائے فرائض میں چست

یہ تھا عہد اعظم کا حسن نظام
سحر کیف زا تھی دلارا تھی شام

نوابزادہ مرزا اصلاح الدین محشرؔ

نوابزادہ صلاح الدین احمد خان محشرؔ۔نواب اعظم مرزا اف لوہارو کے صاحبزادے ہیں۔۷ ۱مئی ۱۹۱۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم ممبئی اور پھر لاہور میں اپچی سن کالج سے مکمل کی۔شعروادب کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی نوعمری ہی سے شعر کہنے لگے۔اپنے کلام پر بذریعہ خط وکتابت اختر شیرانی سے اصلاح لیتے تھے۔خوش شکل۔خوش وضع اور طبیعت باغ و بہار پائی۔زیادہ صحبت رؤساء سے رہی۔موسیقی سے دلچسپی تھی۔سیکھی اور سمجھی ہمیشہ محفل کی جان رہے۔انڈیا میں اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ پر فائز رہے۔اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے اور بھاولپور میں افسر خزانہ رہ کر ریٹائر ہو گئے۔شعر وشاعری کا شغل جاری ہے۔مگر زیادہ وقت یاد الٰہی میں بسر کرتے ہیں۔باری باری اپنے بچوں کے پاس قیام رہتا ہے۔تادمِ تحریر بحمداللہ حیات ہیں۔

نمونہ کلام

غزل

کیا بلا ہیں وہ فتنہ گر آنکھیں
لے گئیں دل ہی چھین کر آنکھیں

جان کر اپنا طالب دیدار
پھیر لیں مجھ کو دیکھ کر آنکھیں

ہم کو رونا پڑے گا آنکھوں کو
یونہی روتی رہیں اگر آنکھیں

شان حق آ گئی نظر محشر
کھل گئیں ان کو دیکھ کر آنکھیں

ڈاکٹر سمیع اللہ قریشی (سفیر پاکستان)

ڈاکٹر سمیع اللہ قریشی۔نواب امین الدین احمد خان ثانی شہریار مرزا کی صاجزادی نوابزادی ماہ بانو بیگم کے شوہر ہیں۔ ۶ جنوری ۱۹۲۶ء کو بمقام آگرہ (انڈیا) پیدا ہوئے۔ان کی پیدائش اپنے ننہیالی محلے حکیماں گلی میں ہوئی جو گلاب خانے کے قریب ہے جہاں غالبؔ اور میر تقی میر پیدا ہوئے۔ سمیع اللہ قریشی کے والد کا نام حشمت اللہ قریشی اور والدہ کا اقبال جہاں بیگم تھا۔ والد شیخان امیٹھی سے تعلق رکھتے تھے جو علمائے قرآن وتفسیر تھے۔والدہ کا خاندان آگرے کے لودھی تھا اور والد یوسف زئی پٹھان جو شمال مغرب سے سو سال پہلے آگرہ میں آ کر آباد ہوئے۔ان کے والد کا مطبع مفید عام آگرہ تھا جو اردو کے دو اولین چھاپے خانوں

میں شمار کیا جاتا تھا۔دوسرا مطبع نول کشور لکھنؤ تھا۔ سمیع قریشی نے آگرے کے شرفاء کی طرح مذہبی اور ادبی ماحول میں پرورش پائی۔ابتدائی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ہوئی۔پھر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور پھر دہلی یونیورسٹی سے ریاضی اور فلسفہ انرز اور پھر ایم۔اے فلسفہ میں ڈگری لی۔مقابلے کے امتحانات کے ذریعے فارن سروس میں ۱۹۴۹ء میں آئے۔انگلستان اور امریکہ میں بین الاقوامی امور میں تعلیم ہوئی۔ جہاں سے ایم۔اے۔اور کینیڈا اوٹوا سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری ملی۔روس، کینیڈا، ہندوستان، ترکی اور جاپان میں پاکستانی سفارت خانوں میں تعینات رہے اور تقریباً 20 بیس سال مختلف ممالک میں سفیر رہے۔جس میں نائجیریا، لبنان، قبرض، مصر، یوگوسلاویہ، البانیہ اور انڈونیشیا شامل ہیں۔یاسر عرفات اور پھر افریقہ کے گیارہ ممالک کیلئے صدر کے خصوصی ایلچی بھیجے گئے لبنان۔مصر اور یوگوسلاویہ نے انہیں اپنے ملک کے اعلیٰ ترین اعزازات دیئے۔جو ان کی اعلیٰ ترین سفارتی نمائندگی پر پاکستان اور ان کے ممالک کے درمیان روابط

بڑھانے کے صلے میں ملے۔ سمیع قریشی وزارت خارجہ میں انڈر سیکریٹری بھی رہے۔ نون نہرو پاک ہند سرحد کے معاہدے کے وفد میں بحیثیت سیکریٹری شامل تھے۔ جہاں انہیں وزیر اعظم نون اور پنڈت جواہر لال نہرو سے پاکستان کے سرحدی مسائل پیش کرنے کیلئے چنا اور وہ نون۔ نہرو کے اس معاہدے کے آرکی ٹیکٹ سمجھے جاتے ہیں۔ سمیع اللہ قریشی ۲۲ گریڈ کے چار اعلیٰ ترین درجہ اوّل کے سفیر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سے انگریزی روزناموں میں کالم نگار ہیں۔ ریڈیو اور پاکستان T.V پر بین الاقوامی امور پر تبصرہ اور حالات حاضرہ پر انٹرویو دیتے ہیں۔ ملک کے دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں۔ اور اپنی خاندانی اور وطنی روایات کی عظمت برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ وہ نہ صرف اردو ادب بلکہ انگریزی ادب سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ اپنی زبان اردو کے علاوہ عربی ترکی اور فرانسیسی زبان میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ عربی کی تعلیم بچپن سے یونیورسٹی تک حاصل کی۔ فرانسیسی میں ''ترجمان'' یعنی بولنے والے کا فرانسیسی میں فوری ترجمہ کرنے کا باقاعدہ امتحان پاس کیا۔ ترکی میں روزمرہ کی گفتگو کر سکتے ہیں۔ اور روسی زبان بھی بول سکتے ہیں ڈاکٹر سمیع قریشی نے چار وقیع اور معروف کتابیں تصنیف کی ہیں کتابوں کے نام یہ ہیں۔ اردو کی دو کتابیں۔

۱۔ نصیحت الملوک۔ امام غزالیؒ کی عربی کتاب کا اردو میں ترجمہ اس کتاب میں امام غزالیؒ نے جو اسلامی نقطۂ نظر سے سیاست کے اصول بتائے ہیں وہ اتنے تازہ ہیں کہ آج ہزار سال کے بعد بھی فرسودہ اور ناقابل عمل نہیں لگتے۔ بالخصوص اس میں جو معاشی اور سماجی انصاف پر تاکید کی گئی ہے۔ (ناشر فضلی برادرز۔ کراچی)

۲۔ حکمران میکیاولی کی ''دی پرنس'' کا ترجمہ۔ ۱۹۹۳ء۔ عالمی شہرت رکھنے والی اس کتاب کا ترجمہ۔ جس میں میکیاولی نے طاقت کے کھیل پر نظر ڈالی ہے۔ اسمیں شاطرانہ طرز کی سیاست کے اصول بتائے گئے ہیں۔ (ناشر نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد)

۳۔ The Contemporary Power Politics and Pakistan.

90 کی دہائی میں بین الاقوامی حالات ایکدم نئی نج پر جانے لگے۔ دنیا کی سیاست کی بساط بدلنے لگی۔اس کتاب میں حالات حاضرہ کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ نئے حالات کس نوعیت کے ہونگے۔(Published by Institute of Policy Studies 1991)

۴ New World Order.(Western fundamentalism in Action)اس میں بش اوّل کے دور میں خلیج کی جنگ کواس تناظر میں دیکھا گیا ہے کہ مشرق وسطی بالخصوص اسلامی دنیا پراس کے کیا اثرات ہونگے۔بش کے اصل مقاصد عراق پر حملہ کرنے سے کیا ہیں اوراس سے کس قسم کی ایک ماتحت خطے کوظہور میں لانے کیلئے کیا کھیل کھیلا جارہا ہے۔اس امر کی پیش گوئی کی گئی ہے کہ آنے والے زمانے میں (90 کی دہائی کے بعد) مسلمانوں پر مکمل امریکی قابو کیسے پالیا جائے گا۔جس سے تمام اسلامی دنیا امریکہ کی Client بن کررہ جائے گی۔اس کی پیشن گوئی کی گئی ہے۔ (Published by Institute of Policy Studies.)

نوابزادی شاہ بانو بیگم

نوابزادی شاہ بانو بیگم۔ ہز ہائی نس نواب امین الدین احمد خان شہریار مرزا کی صاحبزادی ہیں۔ ان کی والدہ سارا سکینہ بانو بیگم نواب سر امیر الدین والئی لوہارو کے بیٹے ہمایوں مرزا کی بیٹی تھیں شاہ بانو ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئیں۔ والدہ کی زیر نگرانی اعلیٰ تعلیم و تربیت پائی۔ لاہور کالج فار ویمن سے تاریخ میں۔ ایم۔ اے۔ کیا شاہ بانو نے ادبی ذوق ورثے میں پایا۔ تحریر و تقریر سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ کتب بینی ان کا محبوب مشغلہ ہے اپنی والدہ کی زیر نگرانی سماجی کاموں میں دلچسپی لیتی رہیں۔ خداترس اور مہمان نواز ہیں۔ نہایت وضع دار اور اپنی خاندانی روایات کی سختی سے پابند۔ ان کی زیادہ توجہ امور خانہ داری رہی۔ والدہ کی وفات کے بعد گھر کا نظم و نسق نہایت عمدگی سے سنبھالتی رہی ہیں شاہ بانو اکثر لکھتی رہی ہیں۔ ان کا ایک معاشرتی ناول ''یادوں کے جزیرے'' شائع ہوا ہے۔ وہ کراچی کلفٹن میں رہائش پذیر ہیں اور اپنے مسلسل بیمار ماموں مرزا عزالدین کی تیمارداری میں مصروف رہ کر ثواب کما رہی ہیں۔

میجر جنرل نوابزادہ شیر علی خان اف پٹودی

نوابزادہ شیر علی خان۔نواب ابراہیم علی خان آف ریاست پاٹودی (موجودہ ہریانہ بھارت) کے صاحبزادے تھےان کی والدہ کا نام شہربانو بیگم تھا۔وہ نواب سرامیر الدین احمد خان کی صاحبزادی تھیں یوں شیر علی خان نواب سرامیر الدین احمد خان کے نواسے تھے۔شیر علی نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور فوج میں کمیشنڈ افسر ہوگئے ان کا شمار نہایت ذہین۔قابل ذمہ دار افسران میں ہوا۔وہ فوجی فاؤنڈیشن کے بانی تھے۔آزادی کے بعد ترقی کرکے میجر جنرل کے عہدے پر پہنچے۔پانچ سال تک ملائشیا میں پاکستان کے ہائی کمشنر رہے۔ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد جنرل یحییٰ کے دور اقتدار میں کچھ عرصہ وزیر اطلاعات بھی رہے۔جنرل شیر علی کی پہلی شادی اپنے خاندان میں جہان آرا بیگم سے ہوئی۔لاولد رہے۔دوسری شادی ساہیوال کے زمیندار گھرانے میں جی معین الدین کے صاحبزادی سلوت آرا سے ہوئی۔ایک صاحبزادی اور چار صاحبزادے ہیں۔جنرل شیر علی نہ صرف ادب نواز تھے بلکہ کئی کتابوں کے مصنف بھی۔انہوں نے انگریزی زبان میں کتابیں تصنیف کیں۔جنرل شیر علی خان طویل علالت کے بعد 89 سال کی عمر میں ۲۹ مئی ۲۰۰۲ء کو لاہور میں انتقال کرگئے۔نواب افتخار علی خان پٹودی ان کے بڑے بھائی تھے۔(کرکٹ میں بین الاقوامی شہرت یافتہ)۔انکی شادی ہزہائی نس نواب سرحمیداللہ خان والئی بھوپال کی دوسری صاحبزادی ساجدہ بیگم سے ہوئی۔

کتابوں کے نام:

1- Soldiering and Politics in India and Pakistan.
2- Quest of Identity.
3- The Elite Minority Princess of India.
4- Rembling of a Tiger.

صاحبزادہ مرزا اعتماد الدین شاہجہاں مرزا

صاحبزادہ اعتماد الدین احمد خان عرف شاہ جہاں مرزا۔ نوابزادہ اعزاز الدین شاہ رخ مرزا کے صاحبزادے تھے۔ اور نواب سرامیر الدین فرخ مرزا کے پوتے تھے ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم دہلی میں حاصل کی۔ ان کی شادی نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کی پڑ پوتی سے ہوئی۔ شاہجہاں مرزا ایک نہایت خوش شکل اور وجیہہ شخصیت تھے۔ علمی وادبی صحبت اختیار کی شعر گوئی کا شوق ہوا۔ اچھے شاعر تھے۔ مگر تفریحاً، باقاعدہ کوئی دیوان نہ چھوڑا۔ دوسری جنگ عظیم میں فوج میں میجر کے عہدے تک ملازمت میں رہے۔ مگر صحت ٹھیک نہ ہونے کے سبب پنشن لے کر تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے۔ کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ۱۹۷۷ء میں کراچی میں وفات پائی۔

نمونہ کلام

غزل

اس کی خوشی اگر ہے تو تو زہر پی کے دیکھ
مرنا تو ایک دن ہے مگر پھر بھی جی کے دیکھ

کب تک یہ اشک ریزی ہے ہجر وفراق میں
دامان تار تار کو چاہے تو سی کے دیکھ

اے شوق بے پنہ ذرا منزل سے بچ کے چل
یہ جام تلخ وتیز ہے تو اس کو پی کے دیکھ

کیسے یقین نہ آئے نہ ہو کیسے اعتمادؔ
آئے نظر جو مر کے اسے کیسے جی کے دیکھ

الحاج صاحبزادہ

ناصر الدین احمد خان المعروف خسرو مرزا

صاحبزادہ ناصر الدین احمد خان خسرو مرزا ۱۸۸٦ء کو پیدا ہوئے۔ خسرو مرزا نوابزادہ بشیر الدین اف لوہارو ولد نواب علاء الدین علائی کے صاحبزادے تھے۔ زمانہ طالب علمی سے علمی وادبی ماحول میں پرورش پائی۔ تعلیم سے فراغت پا کر محکمہ پولیس میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۱۷ء میں ان کی شادی ہوئی۔ خسرو مرزا ایسوی لوہارو کی نمایاں شخصیت تھے۔ نہایت خوبرو۔ مہمان نواز اور وضع دار۔ انہوں نے بہت شاندار اور باوقار زندگی گزاری۔ تقسیم ہند کے بعد اکثر ناواقف لوگ ان سے اسد اللہ خان غالبؔ کے بارے میں سوال کرتے تھے کہ مرزا غالبؔ کی لوہارو سے کیا رشتہ داری ہے۔؟ خسرو مرزا نے کافی معلومات حاصل کرنے کے بعد یہ مناسب خیال کیا کہ ایک مختصر کتابچہ شائع کرا دیا جائے۔ تاکہ سلسلۂ دریافت ختم ہو جائے۔ مگر بصارت کی کمی اور کان کی سماعت میں فرق آ جانے سے انہوں نے محمد نعمان صاحب سے جو ان کے استاد قاری محمد سلیمان کے فرزند ہیں۔ ایک کتابچہ لکھوا دیا۔ کتاب کا نام ہے ''اصہار الغالب'' (غالبؔ کے سسرالی عزیز) خسرو مرزا نے بہت محنت سے نہ صرف مرزا غالبؔ کا شجرہ لکھا بلکہ خاندانِ لوہارو کا شجرہ بھی مرتب کیا۔ مگر خاندانِ لوہارو کے ہم عصر بزرگوں نے ان کا یہ موقف تسلیم نہیں کیا کہ آباؤ اجداد مغل نہیں بلکہ علوی ہیں۔ خسرو مرزا نے ۱۹۷۸ء میں وفات پائی۔ دہلی میں دفن ہیں۔

صاحبزادہ مرزا صمصام الدین فیروزؔ

صاحبزادہ صمصام الدین فیروزؔ۔ ناظم ریاست نوابزادہ عزیزالدین برادر نواب سرامیر الدین احمد خان والئی لوہارو کے صاحبزادے تھے۔ ابتدائی تعلیم لوہارو اور پھر میرٹھ کالج میرٹھ سے مکمل کی۔ اور پنجاب پولیس میں ملازمت اختیار کی۔ ریاست سکیت (ہماچل پردیش انڈیا) اور ریاست لوہارو میں سپرنٹنڈنٹ پولیس رہے۔ مرزا صمصام الدین نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کی پوتی اور نواب اسحٰق خان کی بیٹی انور زمانی بیگم سے کی۔ دوسری شادی نوابزادی حلیمہ بانو اف لوہارو سے کی۔ دونوں بیگمات سے اولادیں ہیں۔ مرزا صمصام الدین کا تخلص فیروزؔ تھا۔ نہایت ذہین اور برجستہ گوئی میں معروف تھے۔ خاندانی حوالوں سے تقریباتی قطعے۔ نظمیں اور اشعار کہتے تھے۔ اکثر فی البدیہہ۔ عموماً مضبوط غزل کے شاعر تھے۔ آخری عمر میں منقبت بھی کہی مرزا صمصام الدین فیروز نے اپنے اشعار کی تعداد آٹھ ہزار بتائی تھی مگر افسوس کہ اپنی مصروف ملازمت اور پھر علالت کے سبب اپنا دیوان شائع نہ کرا سکے۔ مرزا صمصام الدین نہایت خوش رو اور وجیہ شخصیت کے مالک تھے۔ ۱۹۴۸ء میں فسادات کے سبب پاکستان آئے۔ گارڈن ٹاؤن لاہور میں مقیم رہے اور وہیں انتقال کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی صاحبزادی طیبہ بانو۔ بیگم جمیل الدین عالیؔ نے لاہور جا کر ان کی بیاضیں تلاش کیں۔ کچھ کلام اب زیر ترتیب واشاعت ہے۔

خالق نے جب آدم کو دنیا میں کیا پیدا
ایک درد کیا پیدا، کی اس کی دوا پیدا
سامان خزاں خود ہی سامان گلستان ہے
ہر برگ پہ ہوتا ہے اک برگ نیا پیدا
ہے کار گہہ عالم پر ہاتھ مشیت کا
کرسکتی نہیں اس سے کچھ عقل رسا پیدا
فقدان شعوری ہے یہ شعر نہیں میرا
تحمید کے وجداں میں ہے دل کی صدا پیدا

....

اور اے صمصام تجھ کو کیا بتاؤں کیا دیا
دل محبت کے خزانوں سے ترا پُر کردیا
شکر کر اے دل خدائے پاک کا جس نے تجھے
نام پر آقا (اللہ) کے مر جانے کا ایک جوہر دیا

....

وہ طور کی چوٹی ہے ، وہ جلوہ جانانہ
اے ہمت مردانہ ، ہاں ہمت مردانہ
کیا کہہ دیں ہم اس دل کو چھوٹا سا ہے کاشانہ
تم آؤ تو آبادی تم جاؤ تو ویرانہ

....

خان بہادر مرزا شمس الدین شمسؔ

مرزا شمس الدین احمد خان شمس۔ لوہارو کے ناظم نواب اعزالدین احمد خان بن نواب علاء الدین احمد خان علائی، نواب سر امیر الدین احمد خان فرخؔ کے بھتیجے تھے۔ مرزا شمس الدین ۱۸۸۸ء کو قلعہ لوہارو میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ماموں مرزا اسحٰق بیگ سے حاصل کی۔ پھر میرٹھ کالج میرٹھ سے مکمل کی۔ مرزا شمس الدین اپنی خوش لباسی، ذہانت اور ادبی ذوق کیوجہ سے کالج کے مقبول طالب علم تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے پولیس میں ملازمت اختیار کی۔ مگر آپ کی خواہش تھی کہ آپ اپنے وطن لوہارو میں اپنے والد کی طرح کام کریں۔ آپ نے پولیس کی ملازمت سے نیک نامی کے ساتھ سبکدوشی حاصل کی اور بعہد نواب اعزالدین احمد مرزا لوہارو میں ناظم مقرر ہوئے پھر ۱۹۳۳ء تک لوہارو کے دیوان رہے۔ مرزا شمس الدین کی شادی ان کی منجھلی پھوپھی صالحہ بیگم کی صاحبزادی جمیلہ بیگم سے ہوئی۔ آپ کثیر الاولاد تھے۔ نہایت مہمان نواز اور نہایت منتظم تھے۔ ٹینس کھیلنا، مصوری اور کلام شمسی کا مطالعہ ان کے محبوب مشاغل تھے انہوں نے ایک کتاب بھی اپنے ماموں پر لکھی "یادگار رہا" اردو فارسی پر دسترس رکھتے تھے۔ اپنے بزرگوں سے علمی و ادبی ورثہ ملا۔ خوش گو تھے۔ ہمیشہ شاعری سے دلچسپی رہی۔ عموماً تقریباتی شاعری کرتے تھے۔ اپنے کلام پر اصلاح اپنے بڑے بھائی مرزا صمصام الدین فیروز سے لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی نثری مضامین بھی لکھتے تھے جو انجمن ترقی اردو کے ماہنامہ "اردو" میں شائع ہوتے تھے مرزا شمس الدین شمس ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو بمقام لوہارو اور اسی قلعہ لوہارو میں فوت ہوئے جہاں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے چچا نواب سر امیر الدین فرخ مرزا کے دائیں ہاتھ لوہارو کے خاندانی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

نمونہ کلام

سنا حال موسم جو ڈو ماس کا
اٹھایا قلم میز سے پاس کا
سمندر یہاں ریت کا ہے میاں
کہاں وہ مزے کی ہوائیں یہاں
مگر شو خیاں ہیں قلم کی جیہاں
زبانِ لوہارو کمالِ جہاں
بیاں موسم گرم کا کیا کروں
وطن چھوڑکر میں کہاں جارہوں
لوئیں چل رہی ہیں بہت زور کی
ہوائیں بھی ہیں آج کل شور کی
نہیں ہے خبر چور کو چور کی
نہ آواز پپلی سے ہے مور کی
کرہ میں ہے دوزخ کا منظر یہاں
خدا جانے شعلے کہاں ہیں نہاں

فارسی قطعہ

رسید نظم گراں قدر از جناب رسید
برائے خاطر شمس حزیں گلاب رسید
زہے نصیب زسرکار ایں جواب رسید
بپاخ بندۂ دیواں بہ آفتاب رسید

ڈومس بمبئی کی ایک ریاست کا صدر مقام ۔لوہارو کی دونوابزادیاں ۔ارجمند بیگم اور عالمہ بیگم نواب حیدر خان اف سچین سے بیاہی گئیں ۔ڈومس ریاست سچین کا صدر مقام تھا۔

صاحبزادی جہاں آرا بیگم

جہاں آرا بیگم نوابزادہ بشیر الدین بن نواب علاء الدین علائی آف لوہارو کی نواسی ہیں۔ان کی والدہ کا نام صاحبزادی عالیہ بیگم تھا۔عالیہ بیگم ریاست رامپور کے خاندانی چیف منسٹر سرعبدالصمد خان کو بیاہی گئی تھیں۔ جہاں آرا بیگم ۱۹۱۵ء کو رامپور (انڈیا) میں پیدا ہوئیں۔ان کی تعلیم انگریز ٹیوٹر کی نگرانی میں ہوئی۔انہوں نے اپنا بچپن اور جوانی ریاست رامپور کے محلات میں گزارے۔انکے ایک چھوٹے بھائی لیفٹیننٹ جنرل (ر) صاحبزادہ محمد یعقوب خان ہفت زبان ہوئے اور کئی بار پاکستان کے وزیر خارجہ رہے۔

جہاں آرا بیگم کی شادی لکھنو یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور سیدن پور کے تعلقدار شیخ حبیب اللہ کے صاحبزادے اشاعت حبیب اللہ سے ہوئی۔جو ایک نہایت تعلیم یافتہ اور قابل انسان تھے۔انڈیا اور پھر ہجرت کے بعد پاکستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔جہاں آرا بیگم اردو اور فارسی لکھ اور بول سکتی ہیں۔ادب نواز بھی ہیں۔مگر ان کی مشہور تصنیف انگریزی میں ہے۔ان کی کتاب کا نام REMEMBRANCE OF DAYS PAST ہے۔وہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی نے شائع کی ہے۔اس میں انہوں نے اپنے بچپن۔اور جوانی کی یادوں۔خاندانی حالات اور رسم ورواج کو بڑی دقت نظر سے خوبصورت انداز میں تفصیل سے لکھا ہے۔اس کتاب کی شہرت پاک وہند کے علاوہ انگریزی بولنے والی دنیا میں خاصی ہوئی ہے۔جہاں آرا بیگم ڈیفنس سوسائٹی کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔

مرزا غلام قطب الدین فصیح ابن سائل

مرزا غلام قطب الدین فصیح۔ نواب مرزا سراج الدین سائل کے صاحبزادے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں نگینہ محل فراش خانے دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں عربک کالج سے تعلیم حاصل کی۔ فصیح نے شعروادب کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ اپنے ماحول میں علمی وادبی محفلیں دیکھیں تو شعرگوئی کا شوق ہوا۔ استاد بےخود دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ (لوہارو والے اپنے بزرگ مرزا سائل صاحب کی ہدایت پر داغ اور بےخود کے شاگرد ہوتے تھے) مرزا فصیح حسن وخوبی اور وجاہت میں اپنے والد سائل کا نمونہ تھے۔ کھیلوں کی شوقین تھے۔ جوانی میں بلیرڈ، فٹ بال اور ٹیبل ٹینس کھیلنے کی وجہ سے سارے ہندوستان کی سیر کی۔ شکار اور گھڑسواری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ کرکٹ اور شعروشاعری کے سلسلے میں نواب افتخار علی خان اف پاٹودی سے بہت عرصہ تک صحبت رہی۔ مشاعروں میں شوق سے جاکر اپنا دلنشین کلام سناتے۔ تقسیم ہند سے پہلے ان کی زندگی نہایت عیش وآرام میں گزری۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان (لاہور) آگئے۔ فکر روزگار ہوئی۔ آسائیشیں کم ہوگئیں اور زندگی میں انقلاب آیا۔ ایک بزرگ سے متاثر ہوکر سلسلہ قادریہ چشتیہ میں داخل ہوگئے۔ غزلیات کا کلام تلف کرکے نعت گوئی اور منقبت کی طرف رجحان ہوگیا۔ فقرودرویشی کا یہ عالم ہوا کہ کھدر کے کرتے پاجامے کو لباس بنایا۔ محتاجوں کی خدمت اور یادالٰہی میں دن گزرنے لگے۔ عارضۂ قلب بہانہ ہوا۔ ۵ مارچ ۱۹۷۳ء کو خالق حقیقی سے جاملے۔ آخری آرام گاہ میانی صاحب لاہور میں ہے۔

نمونہ کلام

رباعی

نقش لوح کمال ہو جاتا ہے — باعظمت و بے مثال ہو جاتا ہے

گاتے ہیں گن اس کے اہل دنیا کیا کیا — شاعر کا جب انتقال ہو جاتا ہے

نعت

قدم بوسی کریں بس تھی تمنا ایک ہی اپنی

خدا کا شکر ہے آقا نے یہ بھی سن ہی لی اپنی

در اقدس پہ حاضر ہو کے پائی ہے خوشی ایسی

بہت آرام سے گزرے گی باقی زندگی اپنی

جنون عشق نے پہنچا دیا آخر مدینے میں

خدا کا شکر ہے کام آ گئی دیوانگی اپنی

در سرکار دو عالم پہ مرنا اور جینا ہو

تمنا اب بھی یہ ہے اور تمنا تھی یہی اپنی

غزل

میرے نامے میں یہ انداز رقم ہوتا ہے

مجھ کو" تو "لکھتے ہیں اپنے لئے "ہم" ہوتا ہے۔

ہاتھ رکھا ہے میرے سینے پہ جب سے تم نے

درد دل میں میرے ہوتا تو ہے کم ہوتا ہے

یہ بتا دے مجھے کس کس کا یقیں آئے بھلا

تیرا ہر وعدہ و پیماں بقسم ہوتا ہے

غیر اللہ کو یوں دل میں جگہ دے مومن

کہیں اللہ کا گھر بیت صنم ہوتا ہے۔

صاحبزادی عظمیٰ علی

صاحبزادی عظمیٰ علی۔نواب سراج الدین سائل دہلوی کی پوتی اور غلام قطب الدین فصیح کی صاحبزادی ہیں۔۱۹۴۳ء کولاہور میں پیدا ہوئیں۔علمی ماحول میں پرورش پائی۔ادبی ذوق ورثے میں ملا۔باپ اور دادا کے شعر وادب نے ان کے ذہن کو جلا بخشی اپنی فطری دلچسپی اور خاندانی روایات کی پیروی میں اردو ادب میں۔ایم۔اے کیا۔۱۹۶۸ء میں شادی ہوئی۔اسلامیہ کالج برائے خواتین لاہور میں اردو میں استاد کی حیثیت سے درس وتدریس کے فرائض انجام دیۓ۔اپنی گھریلو زندگی۔بچوں کی پرورش۔تعلیم وتربیت کے ساتھ علمی وادبی مصروفیات کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔عظمیٰ نہ صرف خاندان لوہارو کی ایک باوقار شخصیت ہیں بلکہ ایک اچھی ادیبہ اور مضمون نگار بھی۔عظمیٰ علی کا شمار ان معروف خواتین میں ہوتا ہے جنہوں نے علمی وادبی تخلیقات وتحقیقات کے کام انجام دیۓ۔اور نام پایا۔عظمیٰ کی تحریر دل میں بڑے کام کرنے کے جذبے پیدا کرتی ہے۔عظمیٰ مختلف جرائد میں لکھتی رہیں۔تحقیق وتنقید کے حوالے سے ۱۹۷۰ء میں مشہور ومعروف مصنفہ قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' کا تنقیدی جائزہ شائع کیا اہم علمی وادبی شخصیات کے انٹرویو بھی لئے۔جن میں محترمہ بانو قدسیہ ڈاکٹر عبادت بریلوی اور جناب جسٹس جاوید اقبال کے نام شامل ہیں اپنے محترم دادا نواب سراج الدین سائل شاگرد داغ کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب ''سائل دہلوی'' شائع کر چکی ہیں۔کلام سائل کی ترتیب کا سلسلہ جاری ہے جو جلد ہی ''گلگول'' کے عنوان سے شائع ہو جائے گا۔عظمیٰ علی اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں۔

حمیدہ سلطان احمد

حمیدہ سلطان احمد ۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئیں۔ ان کی والدہ کا نام رقیہ سلطان بیگم تھا۔ ان کی نانی نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم نواب ضیاء الدین احمد خان عرف لوہارو نیر رخشان کی صاحبزادی تھیں۔ مرزا غالب کے منہ بولے بیٹے نواب عارف کی بڑی بہو اور مرزا باقر علی کی بیگم تھیں۔ حمیدہ سلطان کی والدہ رقیہ بیگم عرف مچھن بیگم کرنل ذوالنورین علی احمد سے بیاہی گئیں جو ایک روشن خیال انسان اور فوج میں ڈاکٹر تھے۔ حمیدہ سلطان نے ابتدائی تعلیم مذہبی ماحول میں حاصل کی۔ اس زمانے میں عورتوں میں تعلیم کا فقدان تھا۔ مگر کرنل صاحب نے حمیدہ سلطان کو اسکول میں داخل کرا دیا۔ حمیدہ سلطان نے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد اردو فاضل میں بھی کامیابی حاصل کی۔ چونکہ ذہنی طور پر ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ ماحول میں علم وفضل کا چرچا تھا۔ نوعمری ہی سے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ابتدا افسانوں سے کی۔ اخلاقی اور معاشرتی ناول بھی لکھے۔ جن میں اپنے زمانے کی تہذیب کی عکاسی کی۔ ان کے ناول۔ (۱) ثروت بیگم ۱۹۴۲ء (۲) رنگ محل (ناول) ۱۹۶۰ء (۳) بہار و خزاں (ناول) ۱۹۸۶ء یہ ناول اپنے زمانے میں بڑے مقبول ہوئے۔ حمیدہ سلطان نے تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ جگن ناتھ آزاد کی شاعری پر تنقید کی۔ حمیدہ سلطان کی ایک تحقیقی تصنیف "خاندان لوہارو کے شعراء" پر ان کو دہلی میں ساہتیہ کلا پریشد کا ادبی انعام بھی ملا۔ حمیدہ سلطان انجمن ترقی اردو دہلی کی آنریری جنرل سکریٹری بھی رہیں اور چالیس سال تک اردو کی بقا و ترقی اور تحفظ کیلئے کام کیا۔ حمیدہ سلطان نے اپنے بڑے بھائی فخر الدین احمد پر بھی ایک یادگار مضمون لکھا "آ کا بھائی"۔ فخر الدین علی احمد کو ان کی قومی خدمت کے سلسلہ میں صدر جمہوریہ ہند کے عہدے پر فائض کیا گیا۔ حمیدہ سلطان پرانی قدروں کی امین ہیں طویل عرصہ سے علالت کا شکار اپنی حویلی علی منزل میں بقید حیات ہیں۔

امان اللہ خان احمد آسی ضیائی

امان اللہ خان احمد آسی ضیائی۔ ان کے والد ضیاء اللہ خان عابد جن کا شمار ریاست راہپور (یوپی انڈیا) معززین میں ہوتا تھا۔ امان اللہ۔ نوابزادی رضیہ بیگم عرف لوہارو کے نواسے ہیں۔ ان کی والدہ کا نام منیضہ بیگم تھا۔ امان اللہ یکم اگست ۱۹۲۰ء کو ریاست رامپور (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ضیاء الدین عابد نے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔ امان اللہ نے بریلی سے بی۔ اے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اردو ادب میں ایم۔ اے۔ کیا پھر ایل۔ ایل۔ بی۔ کی ڈگری حاصل کی تعلیم سے فراغت پا کر پاکستان ۱۹۴۶ء آ گئے امان نے ادبی ذوق ورثہ میں پایا۔ طالب علمی کے زمانے سے افسانے اور مضامین لکھے جو "ساقی" دہلی اور "نگار" لکھنو (انڈیا) میں شائع ہوتے رہے وہ ہمیشہ تصنیف و تالیف سے وابستہ رہے۔ اور بہت کام کیا۔ ان کی کتابیں نصاب میں بھی شامل ہیں۔

۱۔ ۱۹۵۰ء "کھوٹے سکے" ان کے افسانوں، ڈراموں اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔

۲۔ ۱۹۵۵ء کلام اقبال کا بے لاگ تجزیہ۔ ایک فکری اور تحقیقی مقالہ ہے۔

۳۔ ۱۹۵۶ء "درست اردو" اسمیں عام غلطیوں کی نشاندی کی گئی ہے۔

۴۔ ۱۹۷۴ء میں "برناباس کی انجیل" کا انگریزی سے اردو ترجمہ کیا۔

۵۔ ۱۹۸۴ء میں "ڈنمارک میں سماجی بہبود" انگریزی سے اردو ترجمہ کیا۔

۶۔ ۱۹۶۷ء میں انٹرمیڈیٹ کے لئے گرامر وغیرہ پر مبنی تصنیف

۷۔ ۱۹۹۵ء میں ''داستان گو انیس'' ایک نئے انداز کا مقالہ

۸۔ ۱۹۹۲ء میں ''رگ اندیشہ'' مجموعہ کلام

۹۔ ۱۹۹۴ء میں ''تاریخ زبان وادب اردو'' نصابی تصنیف برائے امتحان پی۔سی۔ایس۔

امان اللہ آسی تخلص کرتے ہیں۔ زبان فارسی، اردو اور عربی میں مہارت رکھتے ہیں۔ گھڑسواری ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ قرأت میں بھی مہارت ہے۔ ان کے ادبی اور تخلیقی کام ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے علمی وادبی کاموں کا سلسلہ جاری ہے۔ مستقل سکونت لاہور میں ہے۔

علی سفیان آفاقی

علی سفیان آفاقی۔ آفاقی کے والد کا نام آفاق علی بیگ تھا۔ آفاقی نواب علاء الدین علائی کے پڑنواسے ہیں۔ آفاقی ۱۹۳۳ء میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ (جو آجکل مدھیہ پردیش کا دارالحکومت ہے) تعلیم دہلی اور میرٹھ میں حاصل کی اور صحافت کا آغاز ۱۹۵۰ء میں روزنامہ ''نوائے وقت'' سے کیا۔ آفاقی اعلیٰ درجے کے ادیب اور انشاء پرداز ہیں۔ روزنامہ ''تسنیم'' سے وابستہ رہے۔ ''چٹان'' ویکلی میں آغا شورش کاشمیری کے ساتھ کام کیا۔ ہنگامہ خیز انٹرویو لئے۔ ''نوائے وقت'' ''امروز'' اور کراچی کے مختلف اخبارات میں مضامین لکھے ہفت روزہ ''نگار'' کے لئے کئی سال تک ڈائری لکھی۔ اور ''سیارہ ڈائجسٹ'' کی ادارت کی۔ لاہور سے شام کا روزنامہ ''نوروز'' بھی جاری کیا۔ علی سفیان آفاقی کچھ عرصہ صحافت سے کنارہ کشی اختیار کر کے فلمی صنعت سے وابستہ ہوئے اور یہاں بھی انہوں نے قابلیت کا ڈنکا بجادیا۔ فلمی کہانیاں اسکرین پلے۔ اور کالم لکھے۔ فلم ساز مصنف اور ہدایت کار کی حیثیت سے ۱۹۷۷ء تک فلمی صنعت میں فعال رہے، کئی بیرونی ملکوں میں بننے والی اردو فلموں کے اسکرپٹ لکھے اور فلم پروڈیوسر ایسوسی ایشن کے نائب صدر رہے۔ فلم ساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے ان کی بیشتر فلمیں سپرہٹ اور یادگار رہیں۔ ان کی فلمیں بیرونی ملکوں میں بھی پیش کی گئیں۔ روس میں فلم ''اجنبی'' کو روسی زبان میں ڈب کر کے پیش کیا گیا۔ فلمی صنعت کے بعد ایڈورٹائیزنگ صحافت سے وابستہ ہو کر کام کیا۔ مولانا سید ابو اعلیٰ مودودی کی سب سے پہلے ''سوانح'' باکمال ادیب وانشاء پرداز آفاقی نے لکھی، آفاقی نے ساحر لدھیانوی۔ آغا شورش کاشمیری اور سیف الدین سیف کی سوانح بھی تحریر کی ہیں۔ ایک افسانوں کا مجموعہ اور دو سیاسی انٹرویوز کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آفاقی کے بارہ سفرنامے شائع ہو چکے ہیں۔ علی سفیان آفاقی کو مختلف اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

۱۔ لائف ممبر پاکستان فلم پروڈیوسر ایسوسی ایشن۔

۲۔ لائف ممبر ڈائریکٹرز ایسوسی ایشن۔

۳۔ نیشنل فلم ایوارڈ کی جیوری کے رکن۔

۴۔ لائف ممبر ایسٹ اینڈ ویسٹ انسٹی ٹیوٹ۔ ہوائی۔ امریکہ۔

۵۔ چیئرمین فلم رائٹرز ایسوسی ایشن۔

علی سفیان آفاقی آجکل صحافت اور ادبی و تخلیقی کاموں میں مصروف ہیں۔ ان کی ایک طویل ''خودنوشت'' زیر تکمیل ہے جو انشاء اللہ عنقریب شائع کر دی جائے گی۔ آفاقی ایک قابل اور نامور صحافی ہیں۔ ان کی خدمات و تخلیقات پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ آجکل ویکلی ''فیملی'' میگزین کے ایڈیٹر ہیں۔ مستقل سکونت لاہور میں ہے۔

صاحبزادہ احمد رضا قصوری

احمد رضا قصوری کے والد کا نام نواب محمد احمد خان تھا جو کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ فرسٹ کلاس مجسٹریٹ اور قصور کے رئیس تھے۔ ان کی والدہ کا نام صاحبزادی میمونہ بیگم تھا جو لوہارو چیف منسٹر کے نوابزادہ عزیز الدین آف لوہارو کی پوتی اور صاحبزادہ مرزا صمصام الدین فیروز کی دوسری بیٹی تھیں احمد رضا قصوری ۱۹۴۰ء میں قصور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم لاہور سے حاصل کی میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے۔ کیا یونیورسٹی لاء کالج سے ایل۔ایل۔بی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ نوعمری ہی سے نہایت ذہن طبع تھے کالج کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ احمد رضا کو خطابت میں کمال حاصل تھا۔ اعلیٰ درجے کے مقرر تھے انگریزی مباحثوں میں انہوں نے قومی سطح پر گیارہ انعام حاصل کئے۔ سماجی کاموں میں بھی ہمیشہ پیش پیش رہے۔ وہ آر۔سی۔ ڈی۔ یوتھ آرگنائزیشن کے صدر اور ترک کلچرل آرگنائیزیشن کے سیکریٹری رہے احمد رضا قصوری پیپلز پارٹی کے بانی ارکان میں سے تھے۔ ذوالفقار بھٹو سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ انہوں نے خلوص اور لگن سے پیپلز پارٹی کیلئے دن رات انتھک کام کیا۔ اور اپنی محنت سے سیاسی حلقوں تعلیمی اداروں اور خاص طور پر طالب علم برادری میں بڑا نام پایا۔ احمد رضا نہ صرف ایک قابل وکیل ہیں بلکہ ایک سچے محب وطن جوشیلے۔ نڈر اور دلیر انسان بھی ہیں۔

۱۹۷۰ء میں جب قومی انتخابات ہوئے تو وہ بھرپور کامیابی کے ساتھ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ مگر کچھ سیاسی اصولوں پر بھٹو صاحب سے اختلافات پیدا ہوئے۔ اور وہ بھٹو کے عتاب میں آگئے اور کئی بار داخل زنداں بھی ہوئے۔ احمد رضا کو جہاں خطابت میں کمال حاصل ہے۔ وہاں ان کی تحریریں بھی قابل مطالعہ ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''اِدھر ہم اُدھر تم'' میں

پیپلز پارٹی کے دورِ اقتدار کے واقعات۔ حالات اور مشاہدات قلمبند کئے ہیں۔ "یہ کس کا لہو ہے" ان کی دوسری کتاب ہے۔

احمد رضا قصوری نے بہت سے ملکوں کی سیاحت کی ۔ برطانیہ، امریکہ، جرمن، ایران، سعودی عرب اور بنگلہ دیش کے دورے کئے اور لندن یونیورسٹی، مانچسٹر یونیورسٹی، امریکہ میں کولمبیا یونیورسٹی ڈلور یونیورسٹی، سٹین فورڈ یونیورسٹی، برکلے یونیورسٹی اور کیلے فورنیا یونیورسٹی میں بھی پاکستان کے آئین اور سیاسی ارتقاء کے موضوع پر خطاب کیا۔

ان کی شادی سید عبداللہ شاہ بخاری کے بھائی سید عنایت اللہ شاہ کی صاحبزادی فہمیدہ بخاری سے ہوئی جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ممتاز ماہر تعلیم ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں احمد رضا قصوری وکالت کر رہے ہیں اور اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں۔

صاحبزادی اُنیسہ بانو

صاحبزادی اُنیسہ بانو۔نوابزادہ مرزا اصلاح الدین احمد خان محشر کی اکلوتی صاحبزادی ہیں۔ان کی والدہ کا نام کشور بیگم تھا۔اُنیسہ بانو ۱۹۴۹ء میں حیدر آباد سندھ میں پیدا ہوئیں۔ابتدائی تعلیم گھریلو ماحول میں دینی تربیت کے ساتھ ہوئی۔حیدر آباد کے انگلش میڈیم اسکول سے انگریزی، اردو اور سندھی زبان پر عبور حاصل کیا۔کالج سے بی۔اے کیا۔اُنیسہ بانو کی ذہانت کا اظہار کالج کی زندگی سے ہوا جہاں انہوں نے اپنی تحریر کا آغاز ''ایک سفرنامہ'' سے کیا۔اس سفرنامے کی تعریف و توصیف نے انہیں قلم پکڑنے کا حوصلہ دیا۔ازدواجی زندگی کا دور شروع ہوا۔مگر گھریلو ذمہ داری اور بچوں کی پرورش کے ساتھ ان کے دماغ کا ادبی کیڑا ابھی پرورش پاتا رہا۔انہوں نے بیکن ہاؤس اسکول میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔اسکول میں پڑھانے کے دوران ان کی دیرینہ خواہش جاگ اٹھی اور کتاب و قلم کا رشتہ دوبارہ قائم ہوا۔انہوں نے نہایت محنت کے ساتھ طالب علموں کیلئے۔تدریسی مواد فراہم کیا۔اور تین نصابی کتابیں تصنیف کیں۔جو اردو زبان میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہیں۔کتابوں کے نام ہیں۔

(۱) شاہین۔ (۲) طاؤس (۳) ہدہد۔جنہیں آکسفورڈ پریس نے شائع کیا ہے۔بلاشبہ اُنیسہ بانو خاندان لوہارو کی قابل فخر خاتون ہیں۔اور پاکستان طلباء طالبات کو اردو ادب کی دنیا سے روشناس کرا رہی ہیں۔اس کے علاوہ بھی ان کا علمی و ادبی کام جاری ہے بیکن ہاؤس اسکول سے وابستہ ہیں۔اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں۔

کتب خانہ لوہارو

(رضا لائبریری رامپور میں)

ہندوستان کی تاریخ میں صوبہ پنجاب اور پنجاب کی تاریخ میں ریاست لوہارو اور اس کے بانی وحکمران خاندان لوہارو کو سماجی۔ ثقافتی اور علمی اعتبار سے اہم مقام حاصل رہا ہے۔ اس خاندان کے اکثر لوگ اہل علم صاحب تصنیف وتالیف اور کتابوں کے شوقین تھے۔ چنانچہ نواب ضیاء الدین احمد خان کے کتب خانے کی اپنے وقت میں بہت شہرت تھی۔ جب ۱۸۵۷ء میں یہ کتب خانہ برباد ہوگیا تو مرزا غالبؔ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتب خانہ بیس ہزار (اس وقت کے) سے زیادہ مالیت کا تھا۔ مگر غدر کے بعد دہلی میں یہ کتب خانہ دوبارہ قائم کیا گیا۔ اس خاندان کا کتب خانہ (سرکاری) ریاست لوہارو میں تھا۔ جس کی دور دور شہرت تھی۔ غالبیات کے سلسلے میں یہ اپنی مثال آپ ہے۔

ریاست رامپور کا شاہی خاندان بھی انتہائی علم دوست اور خاندانِ لوہارو کا شناسا تھا اور دونوں کا تعلق دہلی سے تھا۔ ادھر مرزا غالبؔ لوہارو کے داماد۔ ریاست لوہارو اور ریاست رامپور کے استاد تھے۔ لوہارو کے آخری نواب امین الدین احمد خان ثانی شہریار مرزا نے اپنی ریاست لوہارو کے انڈین یونین میں انضمام کے بعد اپنا بیش قیمت کتب خانہ رضا لائبریری رامپور کو دے دیا۔ جو اس لائبریری میں ''لوہارو کلکشن'' کے نام سے موجود ہے۔ تعداد کے اعتبار سے یہ زخیرہ ۳۵۰ مخطوطات اور اندازاً تین ہزار مطبوعات پر مشتمل ہے۔ کچھ کتابیں تو نادر ونایاب ہیں اس قدیم اور اہم مطبوعات کے ساتھ وہ کتابیں بھی ہیں جو مصنفین نے نوابین لوہارو کو پیش کی ہیں۔ اس کا زخیرہ مخطوطات تو اہم ترین ہے اس اعتبار سے جب ہم لوہارو کلکشن کو دیکھتے ہیں تو اس میں دس

قرآن کے نادر ونایاب مذہب ومطلاء نسخے ہیں۔ کتابوں میں نواب علاء الدین علائی کا تذکرہ "دولت شاہ" قابل ذکر ہے۔ خاندان لوہارو کی بیاض بھی ہیں۔ جن میں معاصرین اور مشاہیر کے دلچسپ تذکرے ہیں۔ اس کتب خانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسمیں مرزا غالب سے متعلق بیش بہا ذخیرہ ہے۔ جس میں دیوان کلیات غالب کا نواب علاء الدین علائی کو پیش کردہ خوبصورت مخطوط۔ غالب کی مطالعہ کی ہوئی کتب۔ الغرض فنون اور زبانوں پر خوش خط اور سونے کے حروف سے لکھی کتابیں ہیں۔ انگریزی کی کتابیں تقریباً آٹھ سو اور ہندی سو کے قریب ہیں۔ ہندی اور انگریزی میں مطبوعات بھی نادر ونایاب ہیں۔

خاص طور پر انگریزی میں یورپ کی باتصویر مطبوعات اور البموں کا اہم ترین کلکشن ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ لوہارو سے تبادلے کے وقت بہت سی مخطوطات اور پرانی کتابیں ضائع ہوگئے تھے۔ بہرحال خدا تعالیٰ اس کتب خانے کو تاقیامت سلامت رکھے۔ اور اہلِ جستجو اس سے استفادہ کرتے رہیں۔ آمین۔

مآخذ

1۔ ذکرِ غالبؔ ---------------------- ڈاکٹر مالک رام

2۔ تلامذۂ غالبؔ ---------------------- ڈاکٹر مالک رام

3۔ آبِ حیات ---------------------- محمد حسین آزادؔ

4۔ محمود علی قصوری ---------------------- عبداللہ ملک (ایڈووکیٹ)

5۔ لوہارو کے شعراء ---------------------- حمیدہ سلطان احمد

6۔ نویدِ سحر ---------------------- کلیم فرید آبادی

7۔ انتخاب خطوطِ غالبؔ ---------------------- ڈاکٹر عبادت بریلوی

8۔ انتخاب کلامِ داغؔ ---------------------- ڈاکٹر محمود الرحمٰن

9۔ خطوطِ غالب ---------------------- ڈاکٹر خلیق انجم

10۔ نمونہ کلام ----------------------

(ا) ---------------------- علائیؔ

(ب) ---------------------- فرخیؔ (لوہارو سیکشن رضا لائبریری رامپور (انڈیا)
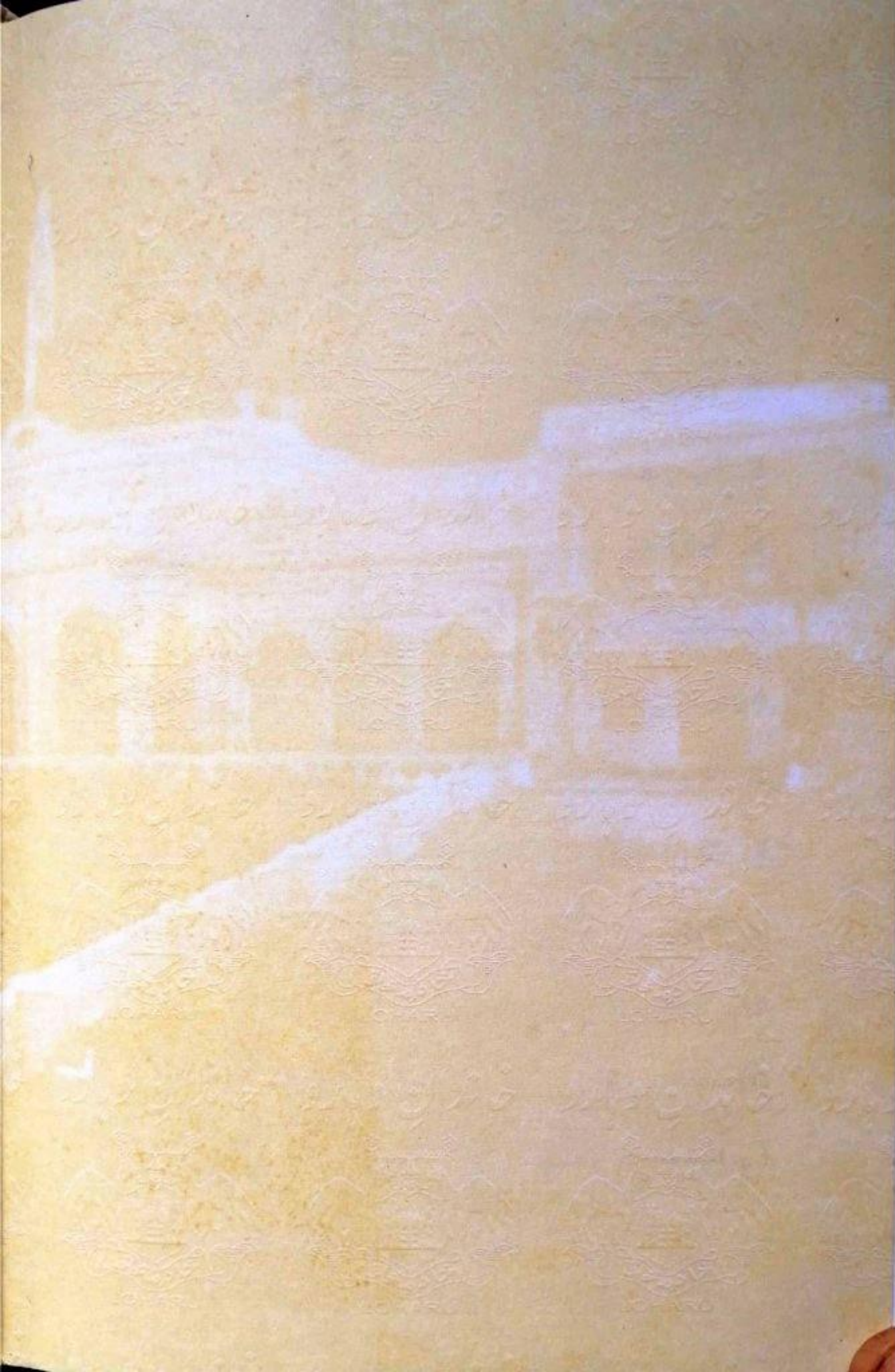
کلب کی ممبر رہیں۔ بچوں کی تعلیم سے خاص دلچسپی رہی۔ کراچی میں پہلی بار جب بیگم منوالا نے بچوں کیلئے مونٹیوری سسٹم قائم کیا تو انہوں نے سب سے پہلے اس گروپ میں شمولیت اختیار کر کے مونٹیوری کی ڈگری حاصل کی اور بچوں کا ایک اسکول CES (چلڈرن ایجوکیشن سروس) کے نام سے کراچی میں قائم کیا۔ اور پانچ سال تک کامیابی سے چلاتی رہیں۔ اسکول میں بچوں کی تربیت کیلئے اپنی نوعیت کا ایک تفریحی کلب بھی قائم کیا۔ جسمیں بچے شام کو تفریح کے ساتھ زندگی کے ادب و آداب کی تربیت بھی حاصل کرتے تھے۔ مگر بیٹوں کے ملک سے باہر چلے جانے پر اسکول بند کرنا پڑا۔ اسکول بند ہونے کے بعد بھی طاہرہ بانو نے تدریسی سلسلہ جاری رکھا اور PECHS اسکول کراچی میں چار سال تک معلمی کے فرائض انجام دیتی رہیں۔ کتب بینی ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ سیر و سیاحت کی غرض بیروت، سریا، لبنان، دمشق، شام، تبوک، جدہ، انگلستان، امریکہ، کینیڈا، ہانگ کانگ اور چین کا سفر اختیار کیا۔ حج کی سعادت بھی حاصل کی۔ شوہر کی ناگہانی موت کے بعد کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوگئیں۔ یہاں آ کر نابیناؤں کے تعلیمی منصوبے میں کیسٹ کے ذریعے تعلیم میں عملی دلچسپی لیتی رہیں۔ طالب علموں کیلئے بیت بازی کی ایک کتاب ''حرفوں کی روشنی'' دو سال قبل شائع ہوئی۔ اب دوسری کتاب ''خاندانِ لوہارو'' مرتب کی ہے۔ اپنے مشاہدات تجربات کی روشنی میں سچی کہانیوں پر مبنی تیسری کتاب ''آنکھیں دیکھتی رہ جاتی ہیں'' زیر ترتیب ہے۔ طاہرہ بانو اپنے بیٹوں کے ساتھ اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں۔

خط

بنام ''نواب مرزا علاؤ الدین علائی والئ لوہارو''

اقبال نشان والا شان، صدرہ عزیز تر از جان، مرزا علاء الدین خان کو

دعاء درویشانہ غالبؔ دیوانہ پہنچے۔

سال نگارش تم کو یاد ہوگا۔ میں نے دبستانِ فارسی کا تم کو اپنا جانشین وخلیفہ قرار دے کر ایک سجل لکھ دیا ہے۔ اب جو چار کم اسی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا بلکہ مہینوں کی نہ رہی۔ شاید بارہ مہینے جس کو ایک برس کہتے ہیں اور جیوں، ورنہ دو چار مہینے، پانچ سات ہفتے، دس بیس دن کی بات رہ گئی ہے۔ اپنے ثباتِ حواس میں اپنے دستخط سے یہ توقیع تم کو لکھ دیتا ہوں کہ فن اردو میں نظماً ونثراً تم میرے جانشین ہو۔ چاہیے کہ میرے جاننے والے جیسا مجھ کو جانتے تھے، ویسا تم کو جانیں اور جس طرح مجھ کو مانتے تھے، تم کو مانیں۔

کُلّ شیٍ ھَالِکٌ اِلّا وَجہ وَیبقیٰ وجہ رَبّکَ ذُوالجلال وَالاکرام۔

غالبؔ

یکشنبہ سلخ صفر ۱۳۸۵ھ

۲۱ جون ۱۸۶۸ء دہلی

(ماخذ خطوط غالب مرتب ڈاکٹر خلیق انجم)